اسرائیل کی تعمیر میں اشتراکی ممالک کا کردار

خلیل احمد حامدی

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ لاہور۔ ڈھاکہ

اسرائیل کی تعمیر میں اشتراکی ممالک کا کردار

سیاسی منصوبے
خفیہ معاہدات
اقتصادی امداد
مقاصد و تعلقات

تالیف : ڈاکٹر ابراھیم الشریقی
ترجمہ : خلیل احمد حامدی

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ
۱۳-ای شاہ عالم مارکٹ لاہور (مغربی پاکستان)
شاخ : ۱۶-بیت المکرم (پہلی منزل) ڈھاکہ (مشرقی پاکستان)

(جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں)

ناشر ۔۔۔۔۔۔۔۔ اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ
۱۳۔ای شاہ عالم مارکٹ، لاہور

طابع ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اخلاق حسین، ڈائرکٹر

مطبع ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ایورگرین پریس لاہور

اشاعت:۔
پہلی جنوری ۱۹۶۹ء ۲۰۰۰

قیمت ۔ ۷۰ پیسے

فہرست مندرجات

۱۔ پیش لفظ	۵
۲۔ موجودہ تاریخ عرب کے دو بڑے المیے	۹
۳۔ عرب عوام حقائق سے بے خبر ہیں	۱۰
۴۔ اکثر اشتراکی لیڈر یہودی ہیں	۱۲
۵۔ لینن اور وائسمین کی ملّی بھگت	۱۳
۶۔ پہلی جنگِ عظیم میں امریکہ کو یہودیوں نے شامل کیا	۱۶
۷۔ جارج کلیمنشو کا موقف یہودیوں کے بارے میں	۱۷
۸۔ اعلان بالفور کی حیثیت	۱۹
۹۔ بالشویک انقلاب اور اس کا سب سے پہلا کارنامہ	۲۰
۱۰۔ فلسطین میں بالشویک انقلاب کا کردار	۲۱
۱۱۔ بالشویک حکومت نے یہودیوں کے لئے زمینیں خریدیں	۲۲
۱۲۔ فلسطین کے اکثر یہودی کمیونسٹ ممالک سے آئے ہیں	۲۳
۱۳۔ یہودیوں کی آبادکاری کے لئے اکثر سرمایہ کمیونسٹ ممالک نے فراہم کیا	۲۴
۱۴۔ برطانوی انتداب کے دور میں عربوں کی مجاہدانہ کوشش	۲۵
۱۵۔ برطانیہ کا قرطاس ابیض	۲۵
۱۶۔ قرطاس ابیض کی منسوخی	۲۶
۱۷۔ روس کی صدارتی کونسل میں یہودی اثرات	۲۷
۱۸۔ کمیونسٹ ممالک نے اسرائیل کو اسلحہ فراہم کیا	۲۸
۱۹۔ یوگوسلاویہ کی طرف سے مفتیٔ فلسطین کو سزائے موت دینے کا مطالبہ	۳۳

۲۰۔ روس کی امداد کے لیے صہیونیوں کا منصوبہ ۳۳

۲۱۔ فلسطین کے مسئلہ پر سلطان عبدالعزیز کی روزویلٹ سے گفتگو ۳۴

۲۲۔ مسئلہ فلسطین اقوام متحدہ میں ۳۶

۲۳۔ عربوں کے خلاف کمیونسٹ بلاک کی کارگذاری ۳۷

۲۴۔ قرار دادِ تقسیم پر بحث اور اشتراکی بلاک کا رویہ ۴۱

۲۵۔ مسئلہ فلسطین سلامتی کونسل میں ۴۴

۲۶۔ اسرائیل کو تسلیم کرنے میں مسابقت ۴۷

۲۷۔ امریکہ اور روس دونوں اسرائیل کے بانی ہیں ۴۷

۲۸۔ اسرائیل اور اشتراکی ممالک کے دوستانہ معاہدے ۴۸

۲۹۔ اشتراکی ممالک اسرائیل کی منڈی ہیں ۵۰

۳۰۔ اسرائیل کی صنعتی اور زرعی ترقی میں کمیونسٹ ممالک کا حصہ ۵۱

۳۱۔ اسرائیل اور سوشلزم ۵۳

۳۲۔ اسرائیل کے مہاجرین میں کمیونسٹ ممالک کا تناسب ۵۴

۳۳۔ ماسکو اسرائیل کے بقا کا حریص ہے ۵۴

۳۴۔ عربوں سے روس کی دوستی کی اصل بنیاد ۵۵

۳۵۔ اشتراکی کیمپ کی طرف سے عربوں کی امداد کی حقیقت ۵۶

۳۶۔ اسرائیل کو تیل کہاں سے ملتا ہے؟ ۵۷

۳۷۔ اسرائیل کی سیاست ماسکو کی خواہش سے ہم آہنگ ہے ۵۹

۳۸۔ روس کی طرف سے پُرامن بقائے باہم کی دعوت ۶۰

۳۹۔ کمیونسٹ حلقوں کی طرف سے آزادیٔ فلسطین کا کبھی مطالبہ نہیں کیا گیا ۶۱

۴۰۔ عرب پریس کا گمراہ کن پروپیگنڈا ۶۳

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

پیشِ لفظ

یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ اسرائیل کے قیام اور تعمیر میں سرمایہ دار بلاک اور کمیونسٹ بلاک، دونوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے اور دونوں نے اپنی اپنی اغراض کے تحت یہودیوں جیسے دشمنِ تہذیب اور ننگِ انسانیت گروہ کو عربوں کے سینے پر سوار کیا ہے۔ اس سلسلے میں جہاں تک سرمایہ دار بلاک کی مساعی اور سازشوں کا تعلق ہے۔ وہ مدت سے طشت از بام ہیں اور بچہ بچہ اُن سے آگاہ ہے۔ اس کے مقابلے میں کمیونسٹ بلاک کا رول غبار آلود رہا ہے۔ حالات پر نظر رکھنے والے تو شروع سے اس بلاک کی دسیسہ کاریوں سے واقف تھے مگر عرب اور مسلم عوام بے خبری کا شکار چلے آ رہے تھے۔ جون ۶۷ء کی عرب و اسرائیل جنگ میں پہلی مرتبہ ان پر یہ بات کھلی، کہ جسے وہ کھرا سمجھ رہے تھے وہ زرِ کم عیار نکلا۔

متعدد عرب مفکرین یہ کوشش کرتے رہے کہ اپنے عوام کو وہ کمیونسٹ بلاک کی منافقانہ چالوں اور اسرائیل نوازیوں سے روشناس کرائیں۔ مگر عربوں کے سوشلسٹ عناصر نے جنہیں بعض عرب ممالک پر غلبہ بھی حاصل ہو گیا تھا، پروپیگنڈے کا اسقدر شدید طوفان اٹھائے رکھا کہ حقائق کا صاف و شفاف چہرہ بے نقاب ہو کر سامنے نہ آ سکا۔ جون ۶۷ء کی جنگ سے چند روز پہلے تک یہ حالت تھی کہ عربوں کے اشتراکیت نواز

عناصر، روس اور اسکے ہمسفر ممالک کو عربوں کی نگاہ میں ایک ایسے دوست کی حیثیت سے پیش کر رہے تھے جو ان کی حفاظت اور دفاع کے لیے بڑے سے بڑا اقدام کرنے سے بھی گریز نہیں کریگا، اور ساتھ ہی یہ رجحان بھی پیدا کر رکھا تھا کہ عربوں کا اصل دشمن اسرائیل نہیں ہے بلکہ امپیریلزم ہے۔ اس لیے مخالفت کا سارا زور اور سیاسی اور عسکری قوت کا تمام تر رُخ اسرائیل اور صہیونی تحریک کے مقابلے کے بجائے ہر اُس طاقت کی طرف مڑ چکا تھا جو اشتراکی سیاست کو بنگاہِ تحسین نہ دیکھتی تھی یا اشتراکیت کے بجائے اسلام کے اندر اپنے مستقبل کی جھلک دیکھتی تھی۔ پروپیگنڈے کا یہ طوفان بلاشبہ سخت گمراہ کن، مغالطہ انگیز اور بلاخیز تھا۔ مگر مصر و شام اور الجزائر و عراق کے چھ سالہ اشتراکی تجربے نے وطن دوست عناصر کو خاصا بے چین کر دیا، اور انہوں نے اشتراکیت کے پوست کندہ حالات عرب عوام کے سامنے رکھنے شروع کر دیے

خاکسار عرب تاریخ کے پچھلے دس سالہ دَور کا برابر مطالعہ کرتا چلا آرہا ہے۔ اس بنا پر ان عرب مفکرین کو داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا، جنہوں نے اشتراکی پروپیگنڈے کے بلاخیز طوفان کے اندر جان ہتھیلی پر رکھ کر اشتراکی کیمپ کی اسلام دشمنی اور یہود نوازی کو واشگاف بیان کیا۔ زیرِ نظر مقالہ کے مصنف ڈاکٹر ابراہیم الشریقی اسی گروہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کے ایک نمایاں فرد ہیں۔ ان کا یہ مقالہ "دور الدول الاشتراکیۃ فی تکوین اسرائیل" کے عنوان سے روزنامہ الحیات (بیروت) اور روزنامہ الریاض (ریاض) میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں یہ کتابی صورت میں چھپا اور وسیع پیمانے پر عرب دنیا میں تقسیم ہوا۔ اسکے بعد متعدد عرب مصنفین نے اس موضوع پر تحقیقی کام کیا، اور نہایت تفصیلی لٹریچر تیار کیا۔ ڈاکٹر صلاح الدین المنجد

ڈاکٹر عمر حلیق اور ڈاکٹر محمد حسین جیسے وسیع النظر محققین اس میدان میں کود پڑے اور اس موضوع پر نہایت قابلِ قدر کام کر ڈالا۔ حتیٰ کہ مصر کی وزارتِ اوقاف کے شعبہ مساجد کے ڈائریکٹر شیخ محمد الغزالی نے بھی الاسلام فی وجہ الزحف الاحمر (اسلام اور سرخ حملے کا مقابلہ) لکھ کر اس بات کا ثبوت مہیا کر دیا ہے کہ اشتراکیت اور اشتراکی کمیپ کی دوستی عربوں کی جڑ کھود رہی ہے۔

ڈاکٹر الشریقی فلسطینی مہاجر ہیں اور عرب دنیا کی نامور علمی اور سیاسی شخصیت ہیں۔ متعدد انٹرنیشنل سائنس اکیڈمیوں کے ممبر ہیں۔ متعدد یورپین یونیورسٹیوں کے وزیٹنگ پروفیسر بھی ہیں۔ ان کی علمی اور تاریخی تحقیقات کا پوری دنیا لوہا مانتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے زیرِ نظر مقالے سے اشتراکی حلقے بڑے سیخ پا ہوئے ہیں۔ مشرقِ اوسط کے مسائل پر ڈاکٹر الشریقی کے قلم سے تقریباً گیارہ کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں اور عربی کے علاوہ انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں چھپ چکی ہیں۔ موصوف خود بھی فرانسیسی زبان کے بہت بڑے عالم ہیں۔ ان کی تازہ ترین تصنیف جسکا آنکھیں بے صبری سے انتظار کر رہی ہیں۔ مشرقِ اوسط میں خاصی ہلچل ڈال دینے والی ہے۔ کتاب کی اہمیت اس کے نام سے واضح ہے، یعنی المؤامرات والجرائم السیاسیۃ فی العالم العربی" (دنیائے عرب کے اندر برپا ہونے والی سازشیں اور سیاسی جرائم)۔ ڈاکٹر الشریقی نے زیرِ نظر کتاب کے اندر جس موضوع پر بحث کی ہے اس پر اور بھی مفید کتابیں وجود میں آچکی ہیں۔ قارئین کی معلومات کے لیے بعض اہم کتابیں ہم ذیل میں درج کیے دیتے ہیں۔

۱۔ المعجزۃ الاشتراکیۃ (اشتراکیت کا معجزہ) از یعقوب منصور

۲- التضلیل الاشتراکی (اشتراکی فریب) از ڈاکٹر محمد صلاح الدین المنجد

۳- اشتراکیتہم واسلامنا (ان کا سوشلزم اور ہمارا اسلام) از بشیر العوف

۴- التضامن المارکسی (مارکسی گٹھ جوڑ) از محمد صلاح الدین المنجد

۵- التحدی الکبیر (عظیم چیلنج) از نہاد القادری

۶- ماذا یجری فی سوریا (شام میں کیا ہو رہا ہے) از نزار قبان

۷- الاشتراکیۃ فی التجارب العربیۃ (سوشلزم عربوں کے تجربات کی روشنی میں) } مختلف مقالات کا مجموعہ

۸- فی قفص الاتہام (مجرموں کے کٹہرے میں) از ڈاکٹر عمر حلیق

۹- موسکو واسرائیل (ماسکو اور اسرائیل) " "

۱۰- یلشفۃ الاسلام (اسلام کو بالشویک بنانے کی کوشش) از ڈاکٹر المنجد

۱۱- اعمدۃ النکبۃ (المیہ کے اصل اسباب) "

۱۲- الشرق والغرب (مشرق ومغرب) از ڈاکٹر ابراہیم الشرقی

۱۳- الغزو الرھیب (ہولناک حملہ) " "

پاکستان کے عوام دنیائے عرب کے مسائل سے ناواقف ہیں اس لیے ہم یہ کوشش کر رہے ہیں کہ دنیائے عرب کے مسائل واحوال پر مشتمل لٹریچر اردو زبان میں مہیا کیا جائے۔ یہ پمفلٹ اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی توفیق شاملِ حال رہی تو اس سلسلے کی مزید کڑیاں نذرِ قارئین ہوتی رہیں گی۔ وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ط

خلیل احمد حامدی
اچھرہ، لاہور

۱۵ر اکتوبر ۱۹۶۸ء

اسرائیل کی تعمیر میں اشتراکی ممالک کا کردار

موجودہ تاریخ عرب کے دو بڑے المیے

پچھلے بیس سالوں کے اندر عرب قوم دو زبردست المیوں سے دوچار ہوئی ہے پہلی مرتبہ ۱۹۴۸ء میں اور دوسری مرتبہ جون ۱۹۶۷ء میں۔ پہلا المیہ یہ تھا کہ یہودیوں نے فلسطین کا اکثر و بیشتر حصہ عربوں سے چھین لیا، اور اسرائیلی ریاست کی داغ بیل ڈال دی۔ دوسرا المیہ درحقیقت ایک فوجی حادثہ تھا، جس نے پوری عرب دنیا کو تاریخ کے سب سے اہم اور پُرخطر نفسیاتی بحران میں مبتلا کر دیا۔ یہ بحران اپنے کچھ نتائج رکھتا ہے اس کے کچھ ضمنی اسباب ہیں، اور خارجی دنیا میں عربوں کی شہرت اور وقار پر اس کے دُور رس اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ اس نئے المیہ کے نتائج و عواقب اپنی ہولناکی کے لحاظ سے اُن تمام آزمائشوں سے زیادہ خطیر و شدید ہیں جو عربوں نے اپنی قدیم تاریخ یا جدید تاریخ میں آج تک بھگتی ہیں۔ یہ المیہ صحیح معنوں میں بلاخیز فتنہ ہے، اسے ایسی عارضی شکست قرار نہیں دیا جا سکتا، جس کے اثرات بسرعت زائل ہو سکتے ہیں۔

پہلے حادثہ میں جو دراصل بین الاقوامی سازش سے عبارت تھا۔ ہم نے فلسطین کے پورے رقبہ میں سے تین چوتھائی حصہ کھویا تھا۔ ۵۵ فیصد تو یو این او کی اس قرارداد تقسیم کی نذر ہو گیا جس کی تائید میں مغرب بھی تھا اور مشرق بھی، اور مزید ۲۲ فیصد جولائی ۱۹۴۸ء کی جنگوں میں گنوا دیا۔ دوسرے حادثہ فاجعہ کو، جس میں عرب بمشکل چھ روز تک میدانِ جنگ میں ٹھہر سکے، پہلے حادثہ پر قیاس نہیں کیا جا

سکتا۔ دوسرے حادثہ میں جو آفتیں ٹوٹی ہیں اور جسقدر تباہی و بربادی ہوتی ہے اور جان و مال اور اسلحہ کا جو بھاری بھرکم نقصان ہوا ہے۔ اُسے پہلے حادثہ سے کوئی مشابہت ہی نہیں ہے۔ مزید براں دوسرے حادثہ میں یہ بھی ہوا ہے۔ کہ اسرائیلی فوجوں نے بیت المقدس سمیت اُردن کا پورا مغربی حصّہ، غزہ کے علاقے صحرائے سینا، سویز کا مشرقی کنارہ، آبنائے تہران اور شامی حدود میں جولان کی اُن تمام پہاڑیوں کو ہتھیا لیا ہے جو بحیرہ طبریہ اور الحولہ کے میدانی علاقے کے لیے حصار کا کام دیتی تھیں۔ اس جنگ میں عربوں کے مالی نقصان کا اندازہ تین ارب ڈالر لگایا گیا ہے۔

پہلے حادثے میں عربوں نے متعدد غلطیوں کا ارتکاب کیا تھا مگر اُن سے کچھ سبق حاصل نہیں کیا گیا، اور فلسطین کے مقبوضہ علاقوں کو واگذار کرانے اور زندگی و موت کی بھرپور جنگ لڑنے کے لیے ان غلطیوں کی تلافی کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ بلکہ سالہا سال تک متواتر پچھلی غلطیوں کا اعادہ اور مزید غلطیوں کا اضافہ ہوتا رہا۔ ایک دوسرے کے خلاف مہمات چلتی رہیں۔ دجل و فریب کے ہتھکنڈے ہماری رہے۔ طرح طرح کے سیاسی نعروں کے ہتھیار فراہم کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کی گئی۔ اتحاد کو پارہ پارہ کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی گئی۔ ان تمام کارروائیوں کا ماحصل اس حادثے کی شکل میں رُونما ہوا جسے ہم دوسرے عظیم المیہ سے تعبیر کر چکے ہیں۔

عرب عوام حقائق سے بے خبر ہیں۔

رہے بے چارے عرب عوام جو صحیح تربیت اور صحت مندانہ رہنمائی کے شدید

محتاج ہیں، مسئلہ فلسطین کے بارے میں ان کی تمام معلومات محض سطحی اور محدود نوعیت کی ہیں۔ انہیں یہ تو معلوم ہے کہ اسرائیل کو قائم کرنے اور مضبوط بنانے میں امریکہ، برطانیہ اور دوسرے مغربی ممالک نے کیا کردار ادا کیا ہے۔ مگر انہیں یہ خبر نہیں ہے کہ اس معاملہ میں روس اور اشتراکی ممالک کا کردار کیا رہا ہے۔ امریکہ اور مغربی ممالک کی طرف سے اسرائیل کی مادی، اخلاقی اور سیاسی پشت پناہی، فلسطین کے اندر یہودیوں کے قومی وطن کے قیام کے لیے تھیوڈر ہرٹزل (۱۸۹۷ء) کا منصوبہ، لارڈ بالفور کا اعلان (۱۹۱۷ء)، اقوام متحدہ کی قرارداد (۱۹۴۷ء) اسرائیل کے قیام (۱۹۴۸ء) اور اسرائیل کو بین الاقوامی انجمن کا رکن بنا لینے کی منظوری (۱۹۴۹ء) ——— یہ تمام حقائق تو بلاشبہ معلوم و معروف ہیں اور کسی دلیل و تشریح کے محتاج نہیں ہیں لیکن جو حقائق ابھی تک پردۂ راز میں ہیں، وہ روس کے بالشویک انقلاب کا وہ مؤثر کردار ہے جو اس نے سرزمین عرب کے اندر صہیونیوں کے پاؤں مضبوط کرنے کے سلسلے میں ادا کیا ہے، اور وہ گراں امدادیں ہیں جو اسرائیل کو سوشلسٹ اور کمیونسٹ کیمپ کی طرف سے ملی ہیں، اور وہ معاہدے ہیں جو روس اور اسرائیل کے مابین قائم ہوتے رہتے ہیں اور وہ خفیہ تعلقات ہیں جو صہیونی تحریک اور مارکسی تحریک کے درمیان وقتاً فوقتاً استوار ہوئے ہیں۔ اسی ناواقفیت کی بدولت عرب اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ فلسطین کی آزادی کے معاملہ میں وہ ان ممالک پر اعتماد کر سکتے ہیں۔

صہیونی سازشیں

کارل مارکس یہودی کی پیدائش اور اس کے کمیونسٹ نظریہ کی اشاعت سے بہت پہلے، یعنی پندرھویں اور سولھویں صدی کے درمیان خفیہ صہیونی تحریکیں اور

یہودی مصنّفین برابر یہ کوشش کرتے رہے کہ مسیحی کلیسا اور پاپائیت کے نظام کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں۔ یہودیوں کی یہ سازشیں اور منصوبے متعدد بار منکشف ہوئے، جن کی وجہ سے یورپ میں بالعموم ان کے خلاف غم و غصہ کے جذبات پھیل گئے، بلکہ اسی کے نتیجے میں یہودیوں کی بڑی بڑی آبادیوں کے خلاف فرانس اور اسپین اور دوسرے ملکوں میں خونریز ہنگامے برپا ہوئے اور یہودیوں کی کثیر تعداد ان ہنگاموں کی نذر ہوئی۔ انیسویں صدی کے اواخر میں خود روس کے اندر سلطنتِ زار کے تخت یہودیوں کا جو قتلِ عام ہوا ہے۔ وہ علمائے تاریخ سے مخفی نہیں ہے۔[1]

یہودی ربّیوں کے منصوبوں کو بروئے کار لانے میں جب صہیونی تحریک ناکام ہوگئی، تو اس نے مارکسزم کا حربہ ایجاد کیا، اور اس نے اس نظریئے کو یورپ میں فلسفیانہ اسلوب اور معاشرتی انقلاب کے رنگ میں فروغ دینا شروع کیا مگر درحقیقت اس کا اصل مدعا یورپ کی روحانی اقدار اور معاشرتی روایات کا تیا پانچہ کرنا تھا کہ صہیونیت کو یورپ پر غلبہ حاصل ہو جائے اور پھر مشرق کی جانب پیش قدمی شروع کر دے۔[2]

اکثر اشتراکی لیڈر یہودی ہیں!

ان صہیونی منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کا آغاز پہلی جنگ عظیم کے دوران ہوا اس معاملے میں نظامِ جاسوسی نے مختلف پہلوؤں سے بہت بڑا رول ادا کیا ہے۔

---

[1] انسائیکلوپیڈیا آف تاریخ سلاطین یورپ (سترھویں تا انیسویں صدی عیسوی) باب یورپ میں عیسائیت کی تاریخ، طبع دوم ۱۵۷۰ء

[2] تاریخ تحریک صہیونیت مطبوعہ پیرس ۱۹۵۰ء

عہد زار میں روس کے اندر، جو اس وقت فرانس اور برطانیہ کے حلیفوں میں سے تھا مارکسی تحریک کے خفیہ اڈے جرمنی کے نظامِ جاسوسی کے ساتھ تعاون کر رہے تھے۔ اس وقت مارکسی تحریک کی لیڈرشپ پر جو لوگ قابض تھے اُن میں سے ایک لینن تھا، دوسرا ٹراٹسکی، تیسرا کاگانووچ اور چوتھا کارل راڈیک۔ لینن کی بیوی یہودی تھی اور وہ خود بھی یہودی ماں کا بیٹا تھا، اور اس کی دادی بھی یہودیہ تھی۔ ٹراٹسکی کے ماں اور باپ دونوں یہودی تھے۔ کاگانووچ کا باپ یہودی تھا اور ماں گمنام اور کارل راڈیک کا پورا گھرانہ سخت روایت پرست یہودیوں میں شمار ہوتا تھا۔ جب زار کی خفیہ پولیس نے خفیہ مارکسی تحریک کی کمین گاہوں پر چھاپے مارے تو لینن اور اس کے چند دوسرے ساتھی جو پولیس کی گرفت سے بچ نکلے جرمنی فرار ہو گئے اور وہاں سے سوئٹزرلینڈ پہنچ گئے۔

لینن اور وائسمین کی ملی بھگت

زیورچ (سوئٹزرلینڈ) میں کارل راڈیک کی موجودگی میں لینن نے مشہور صہیونی لیڈر حاییم وائسمین اور اس کے صہیونی رفیق اور نامور مصنف جاک لیوے، آسٹریا کے یہودی پروفیسر مولیر وفنڈ سیم (جو اشتراکی تحریک کا رکن تھا) اور پولینڈ کے یہودی پروفیسر ڈیوڈ ڈھارن سے ملاقات کی۔ نیز لینن اور وائس مین کے درمیان مئی ۱۹۱۶ء میں ایک یہودی صنعت کار دانیال شوبن کے مکان پر ملاقاتوں کا طویل سلسلہ جاری رہا ان تمام ملاقاتوں میں کمیونسٹ انقلاب کے منصوبے (P.R.S.M) کا جائزہ لیا گیا۔ جس کا ہدف رُوس میں زار کی سلطنت کا خاتمہ اور اس کے ملبے پر مارکسی ریاست کا قیام تھا۔ انہی اجتماعات میں "یہودی منصوبہ برائے مشرق" (P.J.O) پر بھی غور و خوض کیا

گیا۔ یہ منصوبہ ۱۹۰۸ء میں آسٹریا میں ایک ایسی کمیٹی نے وضع کیا تھا جو یورپ کے اشتراکی یہودیوں کے قائدین پر مشتمل تھی۔ اس منصوبے کا مقصد یہودی قوم کے لیے مشرق کا دروازہ کھولنا تھا، تاکہ یہودی قوم فلسطین میں اُتر سکے اور وہاں ایک سوشلسٹ ریاست کی تاسیس کے بعد اسے شرق اوسط کے تمام ممالک کے اندر مارکسی فلسفے کی نشر و اشاعت کا مرکز بن سکے۔

ان اجتماعات کی کارروائی جاک لیوے نے قلمبند کی تھی جو فرانس کی خفیہ پولیس کی السماس برانچ کا ایجنٹ تھا۔ جاک لیوے کے بیان کے مطابق لینن نے گفت و شنید کے دوران وائسمین سے کہا:

"روسی انقلاب کی کامیابی کی بدولت ہی یہود یورپ کے سلاطین اور حکام کے کابوس سے نجات پا سکتے ہیں، اور انہیں حکومت کے اندر اعلیٰ مراتب حاصل ہو سکتے ہیں اور ان کا وقار اور تشخص بحال ہو سکتا ہے۔ یہ انقلاب پراگندہ حال یہودی قوم کا وہ مقصد پورا کر دے گا، جسے پورا کرنے سے ۱۷۸۹ء کا فرانسیسی انقلاب بھی عاجز رہا ہے۔ جونہی رُوس کی سرزمین سے زار کی بساط لپیٹی اور کلیسا کی فرماں روائی ختم ہوئی، وہاں ایک خالصتہً مارکسی ریاست قائم کر دی جائے گی۔ جس کی تعمیر اُن بنیادوں پر استوار ہو گی۔ جن کا مقصد مغرب اور مشرق میں طویل المیعاد منصوبوں کی تکمیل ہے۔"

وائس مین نے اس نظریہ پر رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

"یہود کے لیے مشرق کا دروازہ اسی وقت کھل سکتا ہے کہ عثمانی

سلطنت کو کلیتہً مسمار کر دیا جائے۔ عثمانی سلطنت اگر محو ہو گئی تو اس کے ساتھ ہی وہ تمام دیواریں اور رکاوٹیں زائل ہو جائیں گی جو "ارض موعود" کی طرف پیشقدمی کرنے میں حائل ہو رہی ہیں۔ عثمانی سلطنت کا چراغ اب گل ہوا چاہتا ہے۔ اس لیے یہ انتہائی ضروری ہے کہ جونہی روس کا اشتراکی انقلاب اپنی منزل کو پہنچ جائے فلسطین کے اندر اشتراکی بنیادوں پر دولت یہودیہ کی داغ بیل ڈال دی جائے۔

لینن اور اسکے مجوّزہ انقلاب کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر سائینٹے اپنی کتاب، "صہیونیت اور بالشویک انقلاب" میں جو ۱۹۲۶ء میں میلانو سے شائع ہوئی تھی، لکھتا ہے:

"صہیونیوں کی اشتراکی تحریک صنعتی اور لاطینی یورپ کے اندر اس طرز کے انقلابات بھڑکانے میں ناکام ہو گئی جس طرز کا انقلاب اس نے زار کے روس میں بالشویک انقلاب کے عنوان سے بھڑکایا تھا۔ زار کا روس درحقیقت ایک بہت بڑی سازش کا شکار ہوا جو ۱۹۱۷ء میں اس سرزمین پر نافذ کی گئی۔ روسی قوم یہ سمجھتی ہے، جیسا کہ اسکے ذہن میں ڈالا گیا ہے، بالخصوص مزدوروں اور کسانوں کا طبقہ کہ لینن روسی انقلاب کا بطلِ وحید ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ اشتراکی تحریک کے تمام زعماء یہود تھے اور ٹراٹسکی کی قیادت میں انہوں نے یہ منصوبہ سرانجام دیا۔ یہودی مصنف جاک لیوے نے لیل شہر کے اپنے ایک ڈاکٹر دوست البرٹ ہوان کو ۱۴ ستمبر ۱۹۲۱ء کو جو خط لکھا

ہے اس میں وہ لیغیر لاگ لپیٹ کے کہتا ہے ۔میں نے لینن کو زیورچ میں خوب پہچان لیا تھا - جہاں ایسے متعدد اجتماعات منعقد ہوئے تھے جن میں اشتراکی تحریک کے رہنماؤں نے شرکت کی تھی -صیہونی جمعیت کا جنرل سیکرٹری حاییم وائسمین بھی ان میں شریک ہوا تھا ..... لینن ایک انقلابی آدمی ہے ۔ اس نے جتنے بھی کارنامے انجام دیئے ہیں، ان سب میں وہ ٹراٹسکی کا مرہون منت ہے -یہ شخص کسی ایسی قوم کی قیادت کا اہل نہیں ہے جس کے عوام پڑھے لکھے اور بیدار مغز ہوں ۔"

پہلی جنگ عظیم میں امریکہ کو یہودیوں نے شامل کیا -

پہلی جنگ عظیم کے دوران صیہونی تحریک کی سرگرمیاں عروج پر تھیں - اس تحریک کے خفیہ اجلاس زیادہ تر لندن ، زیورچ اور بال میں منعقد ہوتے تھے، جولائی ۱۹۱۶ء میں لندن میں اس کا جو اجلاس منعقد ہوا تھا - اس میں صیہونی لیڈروں نے بالاتفاق یہ سازش تیار کی کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کو جنگ کے اندر گھسیٹا جائے ، اور اسے اتحادی طاقتوں کا ہمنوا بنایا جائے اور اس کے عوض ان طاقتوں سے یہ وعدہ لے لیا جائے کہ یہود کو فلسطین میں قومی وطن کی تشکیل کی اجازت ہوگی - مذکورہ اجتماع نے حاییم وائسمین اور لیونیل روتھشائلڈ کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ دونوں برطانیہ کے وزیراعظم لائیڈ جارج سے اس موضوع پر بات چیت کریں - چنانچہ لائیڈ جارج نے ان دونوں یہودی رہنماؤں سے اپنے پرائیویٹ آفس میں ملاقات کی اور گفتگو کے اختتام پر ان سے کہا

" امریکہ کے لیے تو اتحادیوں کے پرچم کے نیچے جنگ میں داخل ہونا

آسان ہے، مگر یہود کے لیے قومی وطن کی فراہمی آسان نہیں ہے۔
اس آرزو کی تکمیل اوّلاً اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ اتحادی طاقتیں
جنگ میں کامیاب ہو جائیں اور ثانیاً خود اتحادی طاقتیں بھی
اس کے لیے تیار ہوں، اور ثالثاً جنگ کے بعد مشرق کے بدلتے
ہوئے حالات بھی اس کی اجازت دیں۔ لہٰذا یہودیوں کا فرض ہے
کہ وہ جنگی کوششوں میں حصہ لیں اور اتحادیوں کی فتح کے لیے
جو کچھ بھی فراہم کر سکتے ہوں کریں[1]۔

جارج کلیمنشو کا موقف یہودیوں کے بارے میں!

۱۲ اگست ۱۹۱۶ء کو لائیڈ جارج نے فرانس کے وزیر اعظم جارج کلیمنشو کو ایک خفیہ مراسلہ لکھا جس میں اُسے اُس فراخدلانہ پیش کش سے مطلع کیا جو روشمائلڈ اور وائس مین کی طرف سے پیش کی گئی تھی۔ کلیمنشو نے جس کا لقب "چیتا" تھا، اس مراسلے کے جواب میں لکھا:

"یہ بات حیرت انگیز تو ہے لیکن خلاف توقع نہیں ہے۔ یہودیوں کے پاس
ایسے تجارتی ہتھکنڈے ہیں جن میں انہیں بڑی مہارت حاصل ہے۔ یہ

---

[1] امریکہ اور برطانیہ میں یہودیوں نے اپنے تمام مالی اور تجارتی اداروں کو اتحادیوں کی فتح کے لیے استعمال کیا۔ ان ملکوں میں بنکوں کا نظام اکثر و بیشتر یہودیوں کے قبضہ میں ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران ان ملکوں میں یہودیوں کے ۳۵ بنک تھے۔ درآمد و برآمد کی ایجنسیاں اسکے علاوہ تھیں۔ دیکھو نیویارک، لندن، پیرس اور زیورچ میں ایوان ہائے تجارت کے اعلامیے بابت ۱۹۰۰ء و ۱۹۲۵ء۔

سودا بہت مہنگا ہے اور ضمانت بھی مفقود ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ہم
انہی ذرائع پر بھروسہ کریں جو ہماری دسترس میں ہیں، اور انہی کو بروئے
کار لاکر ہم اپنے دوست امریکہ کو قائل کریں کہ وہ جنگ میں اتحادی
طاقتوں کا ساتھ دینے کے لئے نکل آئے"۔

جنگ کے پورے عرصہ میں اور جنگ کے بعد بھی صہیونیوں کی تگ و دو اور کوششیں برابر جاری رہیں۔ کلیمنشو کے ایک دوست آندرے لیبنو نے ۱۹۲۴ء میں ایک کتاب شائع کی جس کا نام تھا "عالمی جنگ کے چند اسرار" مصنف نے اس کتاب میں، جو اہم دستاویزات سے مزین تھی، صہیونی تحریک کی ان درپردہ مساعی کو بے نقاب کر دیا جو اس نے پہلی عالمی جنگ میں اور روس کی زار حکومت کو ختم کرنے کے سلسلہ میں متعدد پہلوؤں سے انجام دی تھیں۔ لیبنو نے اس کتاب کے تیسرے باب میں لکھا ہے۔ جرمنی اور اس کی حلیف عثمانی سلطنت کے مقابلے میں امریکہ کا اتحادی طاقتوں کے پلڑے میں اپنا بوجھ ڈال دینا بڑا نتیجہ خیز ثابت ہوا۔ خاص طور پر خوراک کی سپلائی کے میدان میں صہیونیوں نے اس جنگ سے جو منافع حاصل کیے ہیں وہ آنے والا وقت ہی صاف صاف بتا سکتا ہے۔ جب حالات کے چہرے سے پردہ اٹھے گا، اور یورپ کی فضاؤں سے باقی ماندہ سیاہ بادل چھٹ جائیں گے۔ لندن کی صہیونی جمعیت نے اس دوستی سے خوب فائدہ اٹھایا۔ جس کے رشتے اس جمعیت کے بعض ارکان اور برطانیہ کی بعض ذمہ دار شخصیتوں کے مابین استوار تھے۔ اس دوستی کی بدولت صہیونی جمعیت نے ان شخصیتوں سے یہ منوالیا۔ کہ فلسطین کے اندر یہودیوں کا قومی وطن بنایا جائے گا۔ حالانکہ یہ فلسطین وہی علاقہ

ہے۔ جس میں عرب اقوام قدیم زمانے سے بستی چلی آرہی ہیں حتیٰ کہ سلطنتِ داؤد کے قیام سے بھی پہلے وہاں عرب موجود تھے اور یہودی سلطنت حضرت عیسٰے (علیہ السلام) کی ولادت مبارکہ سے پہلے ہی مٹ چکی تھی۔

اعلان بالفور کی حیثیت۔

لیونیل روشچائلڈ ایک یہودی سرمایہ دار اور مسٹر بالفر وزیر خارجہ برطانیہ کے درمیان جو دوستانہ روابط تھے، یہ انہی کا کرشمہ ہے کہ یہودی مساعی کا یہ مثبت نتیجہ برآمد ہوا کہ یہودیوں نے اتحادی طاقتوں سے سرکاری طور پر ایک ایسا عہدہ اگلوا لیا، جو یہودیوں کی خواہشوں اور آرزوؤں کو بخوبی شرمندۂ تکمیل کرنے والا تھا۔ حالانکہ لندن اور پیرس میں یہودی زعماء کا یہ منصوبہ پوری کوششوں کے باوجود ناکام ہوگیا تھا اور جس تک مسٹر بالفر کے اس خط کا تعلق ہے جو اس نے ۲ر نومبر ۱۹۱۷ء کو اپنے دوست روشچائلڈ کو لکھا تھا اور جس میں اس نے یہ وعدہ کیا تھا کہ فلسطین کے اندر یہودیوں کا قومی وطن اس شرط پر وجود میں لایا جاسکتا ہے کہ اس سے دوسری غیر یہودی اقوام کے حقوق متاثر نہ ہوں۔ اس خط کو کسی ایسی بین الاقوامی دستاویز کی حیثیت دینے ہیں تو میں شخصی طور پر اُن تمام وثائق کو جو لندن کی یہودی جمعیت کی ملکیت میں ہیں، کاغذ کے پرزوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ بیرون روشچائلڈ کو میرا یہ تاثر پہنچا دیں"۔

تیسرے باب کے آخری پیراگراف میں آندرے لیبنو لکھتا ہے۔ یہودی آئندہ چل کر بالفر کے ذاتی خط کو بین الاقوامی وثیقہ کی شکل دے دیں گے، اور صہیونی تحریک اقوام مشرق کو اس فریب میں مبتلا کر دے گی کہ یہ وثیقہ ایک سرکاری دستاویز ہے۔ مگر جب یہ اقوام خواب غفلت سے بیدار ہوں گی اور حقیقت حال کی تلاش کریں گی تو اس

وقت پانی سر سے گزر چکا ہوگا، اور تاریخ اپنے قیمتی صفحات الٹ چکی ہوں گی۔

بالشویک انقلاب اور اس کا سب سے پہلا کارنامہ

اب روس کے بالشویک انقلاب کی طرف آیئے، جس کی قربان گاہ پر لاکھوں بے گناہ انسانوں کا خون بہا اور جس کے راہنماؤں نے فلسطین کے اندر "سلطنت داؤد" کی تجدید کے لیے صہیونی منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے میں نہایت اہم اور بنیادی رول ادا کیا۔

زیورچ میں لینن اور وانسمین کی ملاقات کے بعد لینن نے برلن کا رخ کیا تاکہ جرمن حکومت سے مدد حاصل کرے۔ وہاں اس نے جرمنی کی خفیہ پولیس کے ذریعہ سے جس کے ساتھ وہ پورا پورا تعاون کر رہا تھا اسلحہ اور روپے کی بہت بڑی مقدار حاصل کر لی۔ مارچ ۱۹۱۷ء کو اس نے یہ تمام ساز و سامان ایک خاص گاڑی کے ذریعہ سے روسی اور ولندیزی کامریڈوں کی ایک جماعت کے ہمراہ مشرقی جرمنی کی روسی سرحد تک پہنچا دیا۔ اس سامان کے انتظار میں ہزاروں یہودی سپاہی جو زار کی فوجوں سے فرار کر چکے تھے، ٹراٹسکی کی معیت میں پہلے سے موجود تھے چنانچہ ان سپاہیوں کو اسلحہ سے لیس کر دیا گیا اور دستوں کی صورت میں یہ روس کے اندر گھس گئے۔ فریب خوردہ کسانوں کی بہت بھاری تعداد بھی ان دستوں میں شامل ہو گئی اور یہ شہروں پر یکبارگی حملہ آور ہو گئے۔ آبادیوں کی آبادیاں انہوں نے ملیامیٹ کر دیں، شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور بالآخر زار کی سلطنت کی بساط الٹ دینے کے بعد وہاں لینن کی صدارت میں مارکسی ریاست کا قیام عمل میں لایا گیا۔[1] مارکسزم کے علمبرداروں

---

[1] ملاحظہ ہو "خفیہ دستاویزات" (برلن)، ۱۹۱۷ - ۱۹۲۰ء: یہودی بنکوں اور سرمایہ داروں نے بالشویک انقلاب میں صہیونی تحریک کے ارکان کی دل کھول کر امداد کی (آگے صفحہ ۲۱ پر)

کا یہ پہلا منصوبہ تھا جس پر عملدرآمد ہوا۔

بالشویک انقلاب نے کامیابی کے بعد سب سے پہلا جو کام انجام دیا وہ یہ تھا کہ روس کو جنگ سے الگ کر لیا۔ یہ مؤقف جرمنی کے حق میں بڑا مفید ثابت ہوا جرمنی کی جو فوجیں مشرق میں روسی محاذ پر جنگ لڑ رہی تھیں وہ فارغ ہو گئیں اور قیصر نے ان سے مغربی محاذ کو مضبوط کر لیا۔ مارچ ۱۹۱۸ء میں لینن کی بالشویک حکومت نے ٹراٹسکی کو بھیجا تاکہ جرمنی کے ساتھ صلح کے معاہدہ پر دستخط کرے۔ چنانچہ برلیسٹ لیٹووسک کے مقام پر اس معاہدہ پر روس کی طرف سے دستخط کئے گئے۔

فلسطین میں بالشویک انقلاب کا کردار

روس میں مارکسی حکومت کو جنم لیے ابھی دو سال بھی مکمل نہیں ہوئے تھے، کہ لینن نے ٹراٹسکی کی قیادت میں ایک کمیٹی تشکیل کی جس کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ وائسمین اور صہیونی لیڈروں نے لینن کے ساتھ مل کر جو منصوبہ تیار کیا رہے اس کے مرحلۂ اول کو عدم سے وجود میں لایا جائے۔ چنانچہ فلسطین کے اندر مارکسی نظریات کی بنیادوں پر ایک یہودی ریاست کے قیام کی راہ ہموار کرنے کے لیے بالشویک حکومت نے دو یہودی لیڈروں کا ایک وفد بھیجا جو جاک شابلیو اور راوول کارنبرگ پر مشتمل تھا۔ ان کے پیش نظر اس علاقے میں کمیونسٹ پارٹی کی تشکیل کی تھی جو بظاہر جاگیرداری قدامت پرستی اور سامراج کا قلع قمع کرنے کو اپنا شعار بنائے۔ مگر دراصل اس پردے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۰، اس امداد کی مجموعی مقدار ۲۵ ملین اسٹرلنگ پونڈ تھی۔ بالشویک کے قائدین یہود تھے۔

میں مشرقِ اوسط کے اندر سائنٹیفک سوشلزم[1] کے اصولوں کا پرچار کرے ۱۹۱۹ء میں یہودی کمیونسٹوں پر مشتمل یہ پارٹی فلسطین کے اندر قائم کی گئی اور یہودی کمیونسٹوں کے ذریعہ سے کارل مارکس کی تعلیمات ہمسایہ ممالک میں پہنچنی شروع ہوگئیں۔ سات سالوں کے اندر عرب ممالک میں چار کمیونسٹ پارٹیاں قائم ہوئیں: مصر ۱۹۲۱ء۔ شام ۱۹۲۴ء۔ لبنان ۱۹۲۵ء، عراق ۱۹۲۷ء

۱۹۲۰ء میں ماسکو سے ولاڈیمیر گابوٹنکی نامی ایک یہودی کمیونسٹ کو جس نے انقلاب کے دوران پیٹرسبرگ (لینن گراڈ) پر حملہ کرنے والے سرخ دستوں کی قیادت کی تھی اور ہزارہا انسانوں کا خون بہایا تھا، فلسطین بھیجا گیا۔ اس کمیونسٹ یہودی کے ذمہ یہ مشن تھا کہ وہ یہودی نوجوانوں کو تربیت دے اور ایک ایسی بٹالین تشکیل کرے جو یہودیوں کی حفاظت کا فریضہ انجام دے۔ اس شخص نے فلسطین میں آکر جگہ جگہ تربیتی کورس شروع کر دیے مگر جب ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء میں بیت المقدس اور یافا میں عربوں اور یہودیوں کے درمیان فسادات برپا ہوئے تو فلسطین کی حکومت انتداب نے حالات کو مزید کشیدگی سے روکنے کے لیے جابوٹنکی کو فلسطین سے نکال دیا۔

بالشویک حکومت نے یہودیوں کے لیے زمینیں خریدیں۔

اوپر ہم نے جس کمیٹی کا ذکر کیا ہے، اس نے دس لاکھ سنہری پونڈ (زار کا سکہ) صرف اس کام کے لیے مخصوص کر دیے کہ فلسطین کے اندر روس کے اشتراکی یہودیوں کے لیے زمینیں خریدی جائیں۔ زار کا ایک سنہری پونڈ عثمانی سلطنت کے پانچ سنہری

---

[1] مارکسزم کو اصطلاحاً سائنٹفک سوشلزم یا انقلابی سوشلزم کہا جاتا ہے

پونڈوں کے برابر ہوتا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں اس کمیٹی نے ایک دو رکنی وفد تشکیل کیا، جو زالوتورین ماٹولیسکی اور سالاٹوف پر مشتمل تھا، اور اسے فلسطین بھیجا تاکہ وہ ان یہودی مہاجروں کی آبادکاری کے لیے زمینیں خریدنے کے مسئلے کا جائزہ لے، جو مختلف مراحل میں روس سے ہجرت کر کے فلسطین میں آباد کیے جائیں گے۔ یہودی ایجنسی کی مدد سے اس وفد نے فلسطین کے تمام ساحلی اور کوہستانی علاقوں کا دورہ کیا اور ان کے جغرافیائی حالات اور زمینوں کی اقسام اور قابل کاشت رقبوں کا سروے کیا اور پھر یہودی ایجنسی کے ماہرین کے اشتراک سے ایک مکمل رپورٹ تیار کر کے نقشوں سمیت لینن اور ٹراٹسکی کو پیش کی۔[۱]

فلسطین کے اکثر یہودی کمیونسٹ ممالک سے آئے ہیں!

مرحلۂ اول میں (جو ۱۹۲۱ء سے لے کر ۱۹۳۹ء تک جاری رہا) روس سے ہجرت کر کے فلسطین آنے والے یہودیوں کی تعداد ایک لاکھ ۶۵ ہزار تھی۔ ان میں وہ چوٹی کے فوجی افسر بھی تھے جو بالشویک انقلاب کے سرخ دستوں کے اندر کام کر چکے تھے۔ مشرقی یورپ اور جرمنی (ہٹلر کے عہد میں) سے آنے والے یہودی اس تعداد کے علاوہ تھے۔ ان کی کل تعداد ۲ لاکھ ۸۰ ہزار تھی۔ برطانوی انتداب کے دور میں فلسطین میں آکر بسنے والے یہودیوں کا تمام تر دارومدار ان بے پناہ سہولتوں پر تھا جو انتداب کی حکومت یہودیوں کے لیے فراہم کرتی تھی اور یا ان مالی امدادوں پر تھا جو دنیا کی صہیونی اور یہودی انجمنیں مسلسل پیش کر رہی تھیں۔ ایسی انجمنوں کی تعداد صرف یورپ میں ۳۴ تھی۔ متحدہ امریکہ میں ۵۸ اور لاطینی

۱۔ ملاحظہ ہو کتاب: "ارض موعود کی طرف" از پروفیسر زانڈا مطبوعہ پراگ ۱۹۳۷ء

امریکہ میں ۱۹- علاوہ ازیں یہودیوں کے بنک اور تجارتی ادارے اپنی سالانہ آمدنیوں کا ایک حصہ بھی اس غرض کے لیے مخصوص کر رہے تھے اور فلسطین کی یہودی ایجنسی کے امدادی فنڈ کو مضبوط کر رہے تھے۔

یہودیوں کی آبادکاری کے لیے اکثر سرمایہ کمیونسٹ ممالک نے فراہم کیا

اس معاملہ میں برطانوی سامراج اور اشتراکیت کے درمیان ملی بھگت کا عجیب منظر ہمارے سامنے آتا ہے۔ برطانوی حکام نے دورِ انتداب میں فلسطین کے دروازے یہودیوں کے لیے چوپٹ کھول کر صہیونی تنظیموں کو یہ ہمت دلا دی کہ وہ یورپ کے یہودیوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں لاکر فلسطین میں آباد کریں اور ان زمینوں کا انہیں مالک بناتے جائیں جو یہودی ایجنسی انتداب کی مدد سے حاصل کر رہی تھی یا عرب باشندوں کو بھاری قیمتوں کا لالچ دے کر ان سے خرید رہی تھی۔ دوسری طرف اگر ہم ان اعلامیوں کو دیکھیں جو پیرس، زیورچ اور ایمسٹرڈیم میں دوسری جنگِ عظیم سے پہلے یہودی اداروں کی طرف سے جاری کیے گئے تھے، اور پروفیسر زانڈا کی مشہور کتاب "ارض موعود کی طرف" (مطبوعہ پراگ ۱۹۳۷ء) اور ارمانڈ شنیٹر کی تالیف "اسٹالن سے وائس مین تک" (مطبوعہ پیرس ۱۹۳۹ء) کا مطالعہ کریں تو ہمیں بآسانی معلوم ہو جائیگا کہ وہ بھاری بھرکم سرمایہ جو فلسطین کے اندر یہودیوں کے قدم جمانے، ان کے لیے زمینیں خریدنے، کالونیاں قائم کرنے اور مثالی بستیاں آباد کرنے کے لئے ۱۹۳۹ء تک مختلف ممالک سے فراہم کیا گیا، اس کا ملک وار تناسب یہ تھا۔

سوویت یونین سے	۴۰ فی صد
مشرقی یورپ سے	۲۸ فی صد

مغربی یورپ سے	۱۶ فیصد
متحدہ امریکہ سے	۱۹ فیصد
لاطینی امریکہ سے	۴ فیصد

برطانوی انتداب کے دور میں عربوں کی مجاہدانہ کوشش

اس مرحلہ میں صہیونی سیلاب کو روکنے کے لیے عربوں کی طرف سے غیر معمولی مخالفت کی گئی - انہوں نے ظالمانہ استعماری سیاست کا بھرپور مقابلہ کیا، اور صہیونی منصوبوں کا سامنا کیا - اس دور میں عربوں کی تحریک مقاومت ایمان اور جہاد اسلامی کی روح سے لبریز تھی اور الحاج امین الحسینی مفتیٔ اعظم فلسطین کی قیادت میں کام کر رہی تھی - اس مرحلے میں عربوں کی طرف سے تین مرتبہ انقلابی کوششیں عمل میں آئیں - ایک ۱۹۲۰ء میں دوسری ۱۹۲۹ء میں اور تیسری جو فلسطین کی "بغاوتِ عظمیٰ" کے نام سے یاد کی جاتی ہے ۱۹۳۶ء میں -

برطانیہ کا قرطاسِ ابیض

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ میونخ کانفرنس کے بعد جو ۱۹۳۸ء میں عالمی امن کی بحالی کی خاطر ہٹلر کے ساتھ اختلافات رفع کرنے کے سلسلے میں منعقد کی گئی تھی برطانیہ اور فرانس دونوں نے ملی بھگت کر کے مشرق اوسط سے متعلق نیا منصوبہ وضع کیا اور اپنی سابقہ پالیسی کے اندر بنیادی تبدیلیاں طے کیں - ان نئی تبدیلیوں کی وجہ دو بنیادی امور تھے

اوّلاً: برطانیہ اور فرانس کے سربراہوں (چیمبرلین اور ڈالاڈے) کو یقین ہو گیا کہ ہٹلر کسی حد پر رکنے والا نہیں ہے اور دوسری جنگ لامحالہ چھڑ کر رہے گی -

ثانیاً: دونوں نے یہ محسوس کر لیا کہ مشرق عربی کی شورشیں اور اضطرابات اس

وقت تک اطمینان بخش حالات میں تبدیل نہیں ہو سکتیں جب تک عرب اقوام کی خواہشات کے تحت ان حالات کی اصلاح نہیں کی جاتی۔

چنانچہ حکومت برطانیہ نے اس فیصلے کے بعد بلا تاخیر ۱۹۳۹ء میں قرطاس ابیض شائع کر دیا اور فلسطین کے بارے میں اپنی نئی سیاست کی یہ بنیادیں وضع کیں۔

۱۔ برطانیہ اس اصول کو تسلیم کرتا ہے کہ دس سال کے اندر اندر "فلسطینی ریاست" قائم کی جائے۔

۲۔ عوامی انتخاب کی بنیاد پر ایک مجلسِ قانون ساز کی تشکیل کی جائے گی۔

۳۔ مخصوص علاقوں کے اندر یہودیوں کے ہاتھ زمینوں کی فروخت ممنوع ہوگی یہ علاقے فلسطین کے مختلف حصّوں میں نشان زدہ کر دیئے گئے ہیں۔

۴۔ یہودی ہجرت کی تحدید (یعنی فلسطین میں داخل ہونے والے یہودی مہاجروں کی سالانہ تعداد معین کر دی جائے گی۔)

قرطاسِ ابیض کی منسوخی

عربوں نے ابتداءً اس قرطاسِ ابیض کی اسکیم کو قبول کرنا چاہا۔ مگر حکومتِ برطانیہ نے اس کے نفاذ کو حالات کی مناسبت کے ساتھ مشروط کر دیا۔ چنانچہ اس شرط نے اور "یہودی ہجرت کی تحدید" کے فقرے نے عربوں کی نگاہ میں برطانوی حکام کی نیتوں اور جدید برطانوی سیاست کو مشکوک کر دیا۔ آخر کار عربوں نے پہلے قرطاسِ ابیض کو مسترد کر دینے کا فیصلہ کیا اور پھر اس کو تسلیم کر کے اس کی تنقید کا مطالبہ کیا۔ یہودی حلقوں کے اندر قرطاسِ ابیض سے کھلبلی مچ گئی۔ لیکن ان کی یہ کھلبلی بہت جلد اطمینان میں تبدیل ہو گئی۔ جب انہیں یہ خوشخبری ملی کہ قرطاسِ ابیض

ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا گیا ہے[1]؛

اس پوری تاریخ کے بطن میں کچھ ایسے حقائق موجود ہیں جو عام نگاہوں سے اوجھل ہیں اور جنہیں ایسے خفیہ ہاتھ نے مستور کر رکھا ہے، جس کے پیچھے ایک ایسی چھپڑی کام کر رہی ہے جو حالات سے ہر وقت ناجائز استفادہ کرتی رہی ہے اور انہیں اپنی منشاء کے مطابق ڈھالتی رہی ہے۔ ان حقائق کو سمجھنے کے لیے ذرا پس پردہ جھانک کر دیکھنا چاہیئے۔

روس کی صدارتی کونسل میں یہودی اثرات

آج ہم جن واقعات سے دوچار ہیں، ان کا سلسلہ ماضی کے واقعات و حالات سے مربوط ہے، لہذا ہمیں بحیثیت اقوام کے گذشتہ ریکارڈ کا مطالعہ کرنا ہوگا کیونکہ یہی ریکارڈ قضیہ فلسطین کی تاریخ کے دوسرے اور تیسرے باب کو مکمل کرتا ہے۔

اس کا پہلا باب ان بین الاقوامی سازشوں پر مشتمل ہے جن کے ہیرو صہیونی سرمایہ دار اور وہ یہودی کمیونسٹ اور انقلاب پسند تھے جنہوں نے روس کے اندر کمیونسٹ اسٹیٹ کی تاسیس کی۔ امید ہے کہ یہ حقیقت اہلِ علم سے پوشیدہ نہیں ہوگی کہ لینن کے عہد میں صدارتی مجلس کی اکثریت یہودی ممبروں پر مشتمل تھی۔ اسٹالن کے دور میں خود اسٹالن اور مولوٹوف اور فوروشیلوف کے ماسوا، اس مجلس کے باقی تمام ارکان یہودی تھے۔ خروشیف سے لے کر کوسیجن کے حالیہ عہد تک مجلس کے نصف ارکان یا تو خالصتہً یہودی ہیں یا یہودی الاصل ہیں۔ بلکہ مشرقی یورپ کے جن ممالک میں اشتراکی نظام قائم کیا گیا ہے وہاں کی مشاورتی کونسلوں اور انتظامی مجالس کے اندر یہودی اشتراکیوں

---

[1] ملاحظہ ہو حایم وائسمین کی ڈائری (لندن اور یہودی ایجنسی کی خفیہ مراسلت)

کا غلبہ ہے ۔ رومانیہ، بلغاریہ، یوگوسلاویہ، ہنگری، پولینڈ، چیکوسلواکیہ کے اندر یہودیوں کی بہت بڑی تعداد پائی جاتی ہے جو کلیدی اسامیوں پر قابض ہے

فلسطین کی تقسیم اور اسرائیل کی تاسیس سے پہلے کے مرحلے میں جو بات زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ جس زمانہ میں فلسطین برطانوی انتداب کے تحت تھا، اور یہودی مار دھاڑ کر کے اسے اپنے قبضے میں لانے کی تیاری کر رہے تھے اس وقت انہوں نے باقاعدہ فوجی یونٹ بنا لیے تھے ۔ ان یونٹوں میں اکثریت جن یہودیوں کی تھی وہ روس، یوگوسلاویہ، رومانیہ اور پولینڈ کے مہاجر تھے جو فلسطین میں آباد کئے گئے تھے اور بیشتر تعداد ان لوگوں کی بھی تھی جو اس یہودی بٹالین میں رہ چکے تھے جس نے برطانوی فوج کے دوش بدوش العالمین اور صحرائے لیبیا کی جنگ میں جرمن اور اطالوی فوجوں کا مقابلہ کیا تھا۔ اسی یہودی بٹالین کے افسروں میں سے ایک موشے دایان اور دوسرا اسحاق رابین تھا ۔ اول الذکر آج اسرائیل کا وزیر جنگ ہے اور ثانی الذکر اسرائیلی افواج کا کمانڈر انچیف ۔

کمیونسٹ ممالک نے اسرائیل کو اسلحہ فراہم کیا۔

اس وقت یہودیوں کو اسلحہ کی سپلائی زیادہ تر مشرقی یورپ سے ہو رہی تھی۔ اور خاص طور پر چیکوسلواکیہ سے جس کے لیے خود اسٹالین نے منظوری دی تھی کچھ اسلحہ اس سرمائے سے حاصل کیا گیا تھا جو امریکہ اور یورپ کی صہیونی تنظیمیں فراہم کر رہی تھیں ۔ یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۸ء میں یہودیوں اور عربوں کی جو جنگ ہوئی اس میں یہودیوں نے وہ اسلحہ استعمال کیا تھا جو انہیں زیادہ تر مشرقی یورپ کے ان ممالک سے ملا تھا، جن پر کمیونسٹوں نے دوسری جنگ

عظیم کے بعد غلبہ پالیا تھا۔ ماسکو کے حکم سے یہودی مشن کو، جو موشے شاریت کی قیادت میں حصول اسلحہ کے لیے گیا ہوا تھا۔ یہ اجازت دی گئی کہ وہ رومانیہ اور یوگوسلاویہ کے بحری جہازوں پر اپنی ضرورت کا جنگی سامان لاد کر حیفا کی بندرگاہ تک پہنچائیں۔ یورپ کے سرکاری بیانات اور بین الاقوامی ایجنسیوں کے حوالوں کی روشنی میں اسلحہ کی یہ کھیپیں مشرقی یورپ سے ذیل کی تعداد میں یہودی مشن کو فراہم کی گئیں۔

چیکوسلواکیہ کے ہوائی جہاز	۲۴
مختلف النوع ٹینک	۱۲۵
بکتر بند گاڑیاں	۴۰۰
بھاری توپیں	۷۰
مختلف النوع توپیں	۳۵۰
رائفلیں اور اسٹین گنیں	۱۰۰۰۰
دستی بم	۱۵۰ ٹن
بارود	۳۰۰۰ ٹن
باربرداری کی گاڑیاں	۱۰۰۰

اسکے علاوہ وہ اسلحہ بھی یہودیوں کے پاس تھا، جو انہوں نے فلسطین میں برطانوی فوج کے گوداموں سے لوٹا تھا، اور وہ اسلحہ بھی شامل تھا جو مغربی یورپ میں اتحادی فوجوں کے ذخائر سے انہوں نے حاصل کیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر کمیونسٹ ممالک اسرائیل کی پشت پناہی نہ کرتے اور بھاری اسلحہ اور ہوائی جہازوں سے اسے کمک نہ پہنچاتے تو اس جنگ کے دوسرے

مرحلے (جولائی ۱۹۴۸ء) میں یہودی ان دور دراز علاقوں میں ثابت قدم نہ رہ سکتے تھے جو تقسیم کی قرارداد میں شامل نہیں تھے۔ مثلاً صحرائے نقب، یافہ اور گلیل کا مغربی حصہ وغیرہ۔ اسلحہ کی سپلائی کے ساتھ اس سازش کا اضافہ کیا جا سکتا ہے، جو جنگ بندی کے نام سے جون ۱۹۴۸ء میں یو۔این۔او کے اندر عربوں پر ٹھونسی گئی۔

یالٹا کانفرنس اور مسئلہ فلسطین۔ اب تھوڑی دیر کے لیے ذرا ۱۹۴۵ء کی طرف لوٹیں اور یالٹا کانفرنس کے ریکارڈ پر طائرانہ نگاہ ڈالیں، جس میں نازی ازم کا قلع قمع کرنے، جرمنی کو اتحادیوں کے مقبوضات میں تقسیم کرنے، جاپانی امپریلزم کی بساط الٹنے اور مشرقی یورپ کے ممالک میں جمہوری حکومتیں قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ یہ خفیہ مذاکرات، جو تین سربراہوں (چرچل، روزویلٹ اور اسٹالن) کے مابین ہوئے، ان کی روداد پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ثانوی درجے کے جن موضوعات پر گفت و شنید ہوئی تھی۔ ان میں سے ایک پولینڈ کا موضوع تھا، اور دوسرا وہ مراسلہ تھا جو صہیونی لیڈروں کی ایک کمیٹی نے اس کانفرنس میں پیش کیا تھا۔ اس مراسلے میں صہیونیوں نے یہ مطالبہ کیا تھا:

۱۔ جرمنی پر مالی تاوان عائد کیا جائے (اس مالی تاوان کی مقدار ۵ ارب ڈالر تجویز کی گئی) اور یہ تاوان ان یہودیوں میں تقسیم کیا جائے جنہیں شدید نقصانات پہنچے ہیں، خواہ وہ جو اس وقت یورپ میں موجود ہیں، اور خواہ وہ جو امریکہ اور فلسطین چلے گئے ہیں۔

۲۔ فلسطین کی طرف یہودیوں کی ہجرت پر تمام پابندیاں اٹھا دی جائیں۔

۳۔ یہودیوں کو اپنا مخصوص سیاسی وجود تشکیل دینے کے لیے ہر طرح کی امداد دی جائے۔

صدر روزویلیٹ کے ایک قریبی سیاستدان جان سوریل کا بیان ہے کہ اس وقت اسٹالن اپنے برطانوی اور امریکی رفقاء کی نسبت یہودیوں کے معاملے میں زیادہ جذباتِ ہمدردی اور جوش و خروش کا مظاہرہ کرتا رہا۔ وہ کہتا تھا کہ یہ وہ مظلوم قوم ہے، جسکے ۳۰ لاکھ افراد مشرقی یورپ میں اور ۲½ لاکھ افراد مغربی یورپ میں جرمن گسٹاپو کی تیغ ستم کا شکار ہوئے ہیں۔ جان سوریل اپنی کتاب "یالٹا سے پوٹسڈم تک" میں، جو سان فرانسسکو میں ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی ہے، لکھتا ہے:

"سوویت یونین کے سربراہ اسٹالن نے مطالبہ کیا کہ جرمنی پر عائد کردہ تاوان کو دگنا کیا جائے، اور یہ یہودیوں کے حوالے کیا جائے، تاکہ وہ فلسطین کے اندر ان ۳۰ لاکھ یہودی مہاجروں کی آبادکاری پر صرف کر سکیں جو سوویت یونین اور مشرقی یورپ سے وہاں ہجرت کر گئے ہیں مگر چرچل نے بڑے لچکدار ڈپلومیٹک اسلوب میں اسٹالن کو جواب دیا، فلسطین کا شاداب علاقہ بہت تنگ ہے۔ ۳۰ لاکھ یہودیوں کی اس میں گنجائش نہیں ہے۔ یہودیوں کی ہجرت پر سے پابندی اٹھا لینے کے بعد عرب ممالک کے اندر ہنگاموں کی لہریں اٹھ کھڑی ہوں گی اور فلسطین جیسے نازک مقام کے معاملے میں عربوں اور یہودیوں کے درمیان خونریز کشمکش کا آغاز ہو جائے گا۔ یہ تمام نہایت پیچیدہ مشکلات ہیں، برطانیہ بین الاقوامی تعاون کے بغیر تنہا ان مشکلات کو حل نہیں کر سکتا۔ اسٹالن یہ جواب سنکر مسکرا دیا اور کہنے

لگا ہمشرق کی اقلیتوں کی مشکلات صرف اس صورت میں حل ہوسکتی ہیں کہ اشتراکی نظام کو وہاں رائج کیا جائے۔ یہ نظام قومی تحریکوں کو ختم کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ ہم نے اسی نظام کی بدولت ان تمام قومی تحریکوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی ہے جو سوویت یونین کے اندر پائی جاتی تھیں اس طرح ہم نے سوویت یونین کو تمام مصائب و مشکلات سے آزاد کر دیا ہے۔ روزویلیٹ نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ہماری معلومات کے مطابق اشتراکی نظام کے اصول و مبادی یورپ کے یہودی فلاسفروں نے وضع کئے ہیں لیکن بایں ہمہ یہ نظام یہودیوں کی منتشر اور پراگندہ قوم کی مشکل کا حل فراہم نہ کر سکا۔ میرے نزدیک بہتر طریقہ یہ ہے کہ جنگ کے خاتمہ کے بعد ایک بین الاقوامی کمیٹی بنائی جائے جو فلسطین کے عمومی حالات کا مطالعہ کرے اور عربوں اور یہودیوں کے مسائل سمجھ کر ان کے لیے پرامن حل تجویز کرے۔"

یالٹا کانفرنس میں اسٹالن نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ مشرقی اور عربی ممالک کے ان تمام زعماء کو بلیک لسٹ میں درج کیا جائے۔ جنہوں نے جرمنی کے نازی حکام کے ساتھ تعلقات قائم کر رکھے ہیں۔ بلکہ ان مصنفین اور ارباب صحافت کو بھی اسی فہرست میں شمار کیا جائے۔ جنہوں نے ہٹلر کے عہد میں نازی ازم کا پروپیگنڈا کرنے میں حصہ لیا ہے۔ بحث و تمحیص کے بعد بالآخر اس بات پر اتفاق ہوا کہ نازی حکام سے تعاون کرنے والوں کو سزا دینے کا معاملہ اس حکومت پر چھوڑ دیا جائے جسکے دائرۂ اختیار میں ایسے لوگ پائے جاتے ہوں۔ تین بڑوں نے یہ بھی بالاتفاق

طے کیا کہ ایک اعلیٰ ٹربیونل قائم کیا جائے جس میں نازی لیڈروں پر مقدمات چلائے جائیں اور اُن میں سے ہر ایک کو خواہ وہ سول کا آدمی ہو یا فوج کا جنگی مجرم قرار دیا جائے اسی فیصلے کی رُو سے جنگ کے بعد نورنبرگ کی مشہور عدالت قائم کی گئی تھی[1]

یوگوسلاویہ کی طرف سے مفتیٔ فلسطین کو سزائے موت دینے کا مطالبہ۔

یہ بات بھی کبھی فراموش نہ ہونی چاہیئے، کہ یوگوسلاویہ کی کمیونسٹ حکومت اور صہیونی تنظیموں نے مل کر نورنبرگ کی اتحادی عدالت کو یہ باور کرانے میں پورا پورا زور صرف کیا کہ الحاج امین الحسینی مفتی اعظم فلسطین کے خلاف جو جھوٹے الزامات عائد کئے گئے تھے، وہ بالکل درست ہیں۔ یوگوسلاویہ اور صہیونیوں کی طرف سے الحاج امین الحسینی کے خلاف جو دو میمورنڈم کمیٹی کے سامنے پیش کئے گئے ان میں یہ دعوے کیا گیا کہ مفتی صاحب نے نازی حکام کو برانگیختہ کیا تھا کہ یہودیوں کو بالکل فنا کر دیا جائے۔ اسی طرح مفتی صاحب نے بوسنہ کے مسلمانوں پر مشتمل عسکری دستے مرتب کیے تھے اور انہیں نازی فوجوں میں شامل کر دیا تھا، تاکہ وہ یوگوسلاویہ کے انقلابیوں کے خلاف نازی فوجوں کے دوش بدوش لڑیں۔ صہیونی تنظیموں کا اس مطالبے سے مقصد یہ تھا کہ اس نامور عرب لیڈر کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے جس نے فلسطین کو صہیونی تحریک کی مقاومت کا مرکز بنا رکھا تھا۔

رُوس کی امداد کے لیے صہیونیوں کا منصوبہ!

جنگ کے متصلاً بعد امریکہ کے یہودی ماہرین سوویٹ یونین کے لیے مفادات حاصل کرنے میں منہمک ہو گئے۔ چنانچہ ان کی مساعی سے سوویٹ یونین نے واشنگٹن

---

[1] نورنبرگ کی عدالت کا ریکارڈ بابت ۱۹۴۵ء و ۱۹۴۶ء

سے بھاری بھرکم امداد حاصل کرلی۔ جس کی مجموعی مقدار نقد کی صورت میں ایک ارب ڈالر اور غذائی مواد، ادویہ، کیمیاوی مواد، زرعی آلات اور مشینری کی شکل میں تین ارب ڈالر تھی۔ صہیونی تحریک کا منصوبہ یہ تھا کہ سوویت یونین کو اپنے ملک میں جدید ترین بھاری صنعتوں کے قیام و فروغ کے لیے حکومت امریکہ کے خزانے اور مالی اداروں اور کمپنیوں کی طرف سے سرمایہ فراہم کیا جائے۔ مگر واشنگٹن کو اس منصوبہ کے اسرار اور اس کے خطرات کا پتہ چل گیا۔ اس سارے منصوبے کی تہ میں جو ارادے کام کر رہے تھے وہ یہ تھے کہ صہیونی تحریک ماسکو کا اعتماد حاصل کرے اور فلسطین کے اندر اپنی سازش کو کامیاب کرنے کے لیے ماسکو کو ضروری قوت فراہم کرے۔[1]

فلسطین کے مسئلہ پر سلطان عبدالعزیز کی روزویلٹ سے گفتگو۔

یالٹا کانفرنس کا ذکر کرتے ہوئے جان سوریل اپنی کتاب کے پانچویں باب میں لکھتا ہے:

"۱۶ فروری ۱۹۴۵ء کو جب صدر روزویلٹ کانفرنس سے فارغ ہو کر واپس جا رہا تھا۔ تو اس نے راستے میں کوئنسی نامی جہاز کے اندر اپنے دوست چرچل کے ہمراہ جزیرۃ العرب کے حکمران سلطان عبدالعزیز بن سعود سے ملاقات کی۔ سلطان کے ساتھ متعدد اقتصادی اور سیاسی

---

[1] ملاحظہ ہو روزویلٹ کے عہد میں امریکہ کے وزیر خارجہ مسٹر سٹاٹینیوس کی ڈائری یہ منصوبہ امریکہ کے وزیر خزانہ مورگنتھاؤ نے پیش کیا تھا جو صہیونی تحریک کا زبردست حامی سمجھا جاتا تھا۔

موضوعات پر بات چیت ہوئی۔ مسئلہ فلسطین اور یہودیوں کی لگاتار ہجرت کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا۔ مذاکرات کے آغاز میں تو سلطان عبدالعزیز بڑی خندہ پیشانی سے گفتگو میں حصہ لیتے رہے۔ مگر جب روزویلٹ نے یہودیوں کا موضوع چھیڑا تو فوراً سلطان کا چہرہ متغیر ہوگیا اور وہ کہنے لگے:

ہر چیز پر غور و خوض کیا جاسکتا ہے اور ہر وہ بات جو آپ کی قوم اور ہماری قوم کے لیے صحیح اور مفید ہوسکتی ہے قبول کی جاسکتی ہے مگر یہودیوں کی ہجرت کا مسئلہ ایسا ہے کہ ہم یہ برداشت نہیں کرسکتے کہ یہ ہجرت بے روک ٹوک جاری رہے۔ یہ ہجرت اگر یوں ہی جاری رہی تو اس سے کئی مسائل جنم لے سکتے ہیں اور عرب اور مغرب کے تعلقات مکدر ہوسکتے ہیں فلسطین عربوں کے لیے انتہائی عزیز اور گراں بہا متاع ہے۔ اسکے کسی معمولی سے حصے کے بارے میں بھی کسی قیمت پر سودے بازی نہیں ہوسکتی۔ ہم یہ خواہش رکھتے ہیں کہ یہ عرب علاقہ پُرامن اور صہیونیوں کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے محفوظ رہے۔"

صدر روزویلٹ عرب فرماں روا کی صاف گوئی سے بڑے خوش ہوئے سلطان کے اس بیان کو پرائیویٹ سیکرٹری نے قلمبند کرلیا، اور اگلی صبح کو مسٹر چرچل کو بھی اس بیان سے مطلع کر دیا گیا۔

اسی کتاب کے پانچویں باب میں صفحہ ۳۲۶ پر مسٹر جان سویل رقمطراز ہے:

"چرچل نے سلطان عبدالعزیز کے بارے میں اپنے دوست روزویلٹ کے تاثرات دریافت کیے۔ روزویلٹ نے کہا: "مجھے اندازہ ہوا ہے کہ

یہ شخص بڑا راست باز ہے، جری ہے۔ بے لاگ ہے۔ زندگی کی کوئی کشش اس پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ اس کی گفتگو سے مجھے یقین ہوگیا ہے کہ فلسطین میں یہودیوں کا اجتماع مشرق کے امن کو بھسم کر دیگا اور عرب ہر ممکن ذریعہ سے یہودیوں کی مقاومت کرینگے۔ یہ بات انتہائی خطرناک ہے۔ ہمیں عربوں سے اپنے تعلقات کو محفوظ رکھنے اور مشترک مفادات کے تحفظ کے لیے اس خطرے کا لازماً تدارک کرنا چاہیئے"۔

مگر قبل اسکے کہ جرمنی بلا قید و شرط ہتھیار ڈالتا، اور جرمنی کا نازی ازم اپنی موت آپ مرتا، روزویلیٹ ۱۵ اپریل ۱۹۴۵ء کو دنیا سے کوچ کر گیا، اور ٹرومین اس کا جانشین ہوا۔ جو یہود نوازی میں مشہور تھا۔ ڈیموکریٹک پارٹی کی کامیابی کے لیے اس نے امریکہ کے ۵۰ لاکھ یہودیوں کے ووٹ حاصل کرنے کے لالچ میں یہودیوں کی ہر طرح سے پشت پناہی کی اور امریکہ کو بین الاقوامی بددیانتی کی اس راہ پر ڈال دیا، جس پر وہ آجتک آگے ہی آگے بڑھتا چلا جارہا ہے۔

مسئلہ فلسطین اقوام متحدہ میں۔

اپریل ۱۹۴۷ء میں برطانیہ نے مسئلہ فلسطین کو اقوام متحدہ کی میز پر رکھ دیا، تاکہ اس مسئلے کے بارے میں جو قرارداد بھی پاس ہو۔ اس کی ذمہ داری تنہا برطانیہ پر نہ ہو۔ بلکہ بین الاقوامی تنظیم کے سر منڈھ دی جائے۔ اس نے یہ اقدام اس لیے نہیں کیا تھا کہ وہ عربوں کی کوئی خدمت کرنا چاہتا تھا، بلکہ صرف اس لیے کیا تھا کہ اس طرح سے وہ ہر اس فیصلے کی ذمہ داری سے بری ہوسکتا ہے جو آئندہ عربوں کے ساتھ اس کے تعلقات پر اثر انداز ہوسکتا ہو۔

اقوام متحدہ میں جب یہ مسئلہ پہنچا تو مغرب اور مشرق کے دونوں کیمپوں کے درمیان سودے بازی نے بڑی خطرناک شکل اختیار کر لی۔ یہ اپنی نوعیت کی ایک ہی شرمناک سازش تھی جس کا خمیازہ نہ صرف فلسطینی قوم کو بلکہ پوری عرب دنیا کو بھگتنا پڑا۔ عرب دنیا کے ۹۹ فیصد لوگ یہ تو جانتے ہیں کہ اس سازش میں امریکہ و برطانیہ اور مغربی ممالک کا کردار کیا تھا، مگر وہ اس بات سے قطعی بے خبر ہیں کہ اقوام متحدہ کے اندر عرب سیاستدانوں کی نگاہوں سے اوجھل رہ کر سوویت یونین اور کمیونسٹ بلاک نے مسئلہ فلسطین کے بارے میں کیا افسوسناک کردار ادا کیا ہے۔ میں پوری صاف گوئی اور وثوق سے کہتا ہوں اور خود اقوام متحدہ کی روداد وں کی بنیاد پر کہتا ہوں کہ جب سے فلسطین کا مسئلہ اقوام متحدہ کی بساط پر زیر بحث آیا ہے اور جب سے اسرائیل کا منحوس وجود عمل میں آیا ہے ماسکو کا رویہ یہودیوں کے حق میں ہی رہا ہے۔ جو شخص اس کے خلاف رائے رکھتا ہے۔ میری اس سے درخواست ہے کہ وہ ذرا ۱۹۴۷ء، ۱۹۴۸ء، اور ۱۹۴۹ء کے تین سالوں کی اقوام متحدہ کی فائلوں کی ورق گردانی کرے تاکہ اسے میرے دعوے کی اصلیت معلوم ہو جائے۔ نیز ۱۹۵۰ء سے لے کر ۱۹۶۵ء تک ۱۵ سالوں کے اندر اسرائیل اور وارسا پیکٹ کی کمیونسٹ ریاستوں کے مابین، جن کی قیادت ماسکو کے ہاتھ میں ہے جو اقتصادی اور ثقافتی اور فنی معاہدات ہوئے ہیں ان پر بھی ایک نظر ڈال لے۔ اس کے بعد وہ کبھی یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ کمیونسٹ بلاک اسرائیل نواز نہیں ہے۔

عربوں کے خلاف کمیونسٹ بلاک کی کارگزاری۔

اقوام متحدہ کی میز پر فلسطین کا مسئلہ پہلی بار اپریل ۱۹۴۷ء میں زیر بحث آیا۔ فلسطین کے موضوع پر اقوام متحدہ کا یہ ہنگامی اجلاس ۲۸ اپریل سے لے کر ۱۵ مئی ۱۹۴۷ء تک

جاری رہا۔ عربوں کی اس پہلی سیاسی جنگ میں مشرقی بلاک نے روسی نمائندے کامریڈ گرومیکو (جو آجکل روس کے وزیر خارجہ ہیں) کے زیر قیادت اپنی ساری طاقت اس بنیادی نقطے پر مرکوز کیے رکھی کہ کسی طرح اقوام متحدہ سے فلسطین میں یہودی وجود کی قانونی حیثیت کو تسلیم کروالیا جائے۔

عرب ممالک کے مندوبین نے اس اجلاس میں ایک میمورنڈم پیش کیا۔ جس میں اقوام متحدہ سے یہ مطالبہ کیا تھا، کہ فلسطین سے برطانوی انتداب اٹھا دیا جائے اور فلسطین کی آزادی کا اعلان کر دیا جائے۔ اس مطالبے کے جواب میں روسی نمائندے گرومیکو نے عرب نمائندوں پر تند و تلخ حملہ کیا۔ ۲۹ اپریل کے اجلاس میں اس نے واشگاف الفاظ میں کہا۔

"فلسطین میں یہودی قوم اپنا وجود رکھتی ہے۔ اس قوم کے احساسات کا لحاظ اور اقوام متحدہ کے اندر اس کی آواز پر کان دھرنا ضروری ہے اقوام متحدہ کی کوئی طاقت اس بات پر مجبور نہیں کر سکتی، کہ وہ کوئی ایسی قرارداد منظور کرے جو عربوں کے مطالبے کی حمایت میں فلسطینی قوم کے استقلال کے اعلان کی تائید کرے۔"

۲ مئی کے اجلاس میں اس نے کہا:

"فلسطین کا جھگڑا ذاتِ خود اور اپنے تاریخی مزاج کی رو سے یہ لازم ٹھہراتا ہے کہ یہودیوں کو اس جھگڑے کے حل میں شرکت کا حق دیا جائے۔ یہ جھگڑا دراصل یہودی قوم ہی کا مسئلہ ہے۔"

گرومیکو کی تائید کرتے ہوئے چیکوسلواکیہ کے کمیونسٹ نمائندے جان بابانک

نے کہا۔

"یہودی قوم کے مطالبات عین حق و انصاف ہیں۔ یہودیوں نے برطانوی انتداب سے طویل مدت پہلے فلسطین کی تعمیر و آبادکاری شروع کر دی تھی۔ فلسطین پر یہودیوں کے حقوق نہ صرف تاریخی طور پر درست ہیں بلکہ قانوناً بھی صحیح ہیں"۔

پولینڈ کے کمیونسٹ نمائندے جوزف ونیٹوٹز نے اپنی باری آنے پر کہا:

"قضیہ فلسطین کے بارے میں کسی فیصلہ پر بھی اس وقت تک غور و خوض نہیں کیا جاسکتا۔ جب تک جنرل اسمبلی کی کارروائیوں میں یہودی ایجنسی کو شرکت کا حق نہ دیا جائے۔ پولینڈ کی حکومت یہودی قوم کے مفادات اور اس کے مستقبل سے پوری دلچسپی رکھتی ہے"

پولینڈ کے نمائندے نے امریکہ سے بھی اپیل کی کہ اسے پولینڈ اور دیگر اشتراکی ممالک کے نقطۂ نظر کی پوری پوری حمایت کرنی چاہیئے۔

۳؍مئی کے اجلاس میں گرومیکو نے کہا۔

"فلسطین کا مسئلہ صرف عربوں کا مسئلہ نہیں ہے جیسا کہ عرب اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں، اور یہودیوں کے جذبات کی رعایت کیے بغیر اقوام متحدہ کے اندر اس پر بحث کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ..... شور و شغب، واویلا اور سرگوشیاں اور اسی نوعیت کے دوسرے ہتھکنڈے جو عرب اس وقت استعمال کر رہے ہیں۔ ان سے ہمیں بڑا دکھ پہنچا ہے۔ عربوں کو تاریخی اور قانونی پہلو سے امر واقعہ کو سمجھنا اور تسلیم کرنا چاہیئے"۔

یوگوسلاویہ اور چیکوسلواکیہ اور پولینڈ کے مندوبین نے کامریڈ گرومیکو کی ہر پہلو سے حمایت کی اور اس کے موقف کو ہر لحاظ سے درست اور برحق قرار دیا۔

سعودی عرب، مصر، عراق، شام اور لبنان کے نمائندوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا کہ جسطرح اقوام متحدہ میں یہودی ایجنسی کو یہودی قوم کا جائز نمائندہ تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اسی طرح فلسطین کی اسلامی عرب کمیٹی کو بھی اقوام متحدہ کے اندر فلسطینی قوم کے مفادات کے قانونی نمائندے کی حیثیت سے قبول کر لیا جائے۔ لیکن عرب نمائندوں کی تمام کوششیں روسی بلاک کی شدید مخالفت اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے بے سود ثابت ہوئیں۔

سیاسی کمیٹی کا اجلاس (۱۴ مئی ۱۹۴۷ء) ایک ایسی قرارداد پر ختم ہوا جس میں یہ طے کیا گیا کہ مسئلہ فلسطین کے مطالعہ اور تحقیق کے لیے ایک بین الاقوامی کمیٹی تشکیل کی جائے۔ گرومیکو نے اس اجلاس میں اسٹیج پر چڑھ کر اعلان کیا۔

"یہودی قوم جینے کے لیے پیدا ہوئی ہے، اسی طرح جسطرح دوسری قومیں آزاد زندگی کے لیے جدوجہد کر رہی ہیں۔ یہود مسلسل المیوں اور اکھیڑ پچھاڑ اور تعذیب و تشدد کا نشانہ بنتے رہے ہیں۔ اب اقوام متحدہ کا فرض ہے کہ وہ ان کی آرزوؤں کو پورا کرے اور فلسطین میں ان کے حقوق کو تسلیم کر لے۔ فلسطین اس قوم کی تاریخ اور عمیق تہذیب کا گہوارہ ہے۔ عالمی تحقیقاتی کمیٹی کا بھی فرض ہے کہ وہ اس ملک میں یہودی قوم کے حاصل کردہ حقوق اور تاریخی حقوق کا پورا پورا لحاظ رکھے۔"

قراردادِ تقسیم پر بحث اور اشتراکی بلاک کا رویہ

ستمبر ۱۹۴۷ء میں سیاسی کمیٹی کا ایک اجلاس منعقد کیا گیا، جس میں تحقیقاتی کمیٹی کی تجویز کردہ قرارداد تقسیم پر غور و خوض ہوا۔ اس اجلاس میں سوویت بلاک نے قرارداد تقسیم کے مسودہ کی پُرجوش تائید کی اور عربوں کے مطالبات پر اس قدر تکلیف دہ اور تلخ انداز میں تنقید کی، جس کی وجہ سے اقوام متحدہ کے حلقوں میں سخت ہلچل برپا ہوگئی۔ ذیل میں ہم سرکاری ریکارڈ کے حوالوں سے سیاسی کمیٹی کی بحثوں اور ان تمام تجویزوں کا خلاصہ پیش کرتے ہیں جو اس کمیٹی کے سامنے رکھی گئیں۔

عرب نمایندوں نے ایک یادداشت پیش کی جس میں تقسیم کی تجویز کو کلیتہً مسترد کر دیا اور یہ مطالبہ کیا کہ فلسطین میں ایک آزاد جمہوری حکومت قائم کی جائے جس میں یہودی اقلیت کو اپنے حقوق کی پوری ضمانت حاصل ہو۔ اس یادداشت کے ساتھ انہوں نے ایک مفصل بیان بھی شامل کر دیا جو فلسطین پر عربوں کے حق کی تاریخی اور قانونی پہلوؤں سے مدلل تصویر تھا۔ عراق کے نمائندے ڈاکٹر فاضل الجمالی اور لبنان کے نمائندے ڈاکٹر چارلس مالک نے بھی الگ الگ بیانات دیئے جن میں حالات کا حقیقت پسندانہ جائزہ پیش کیا اور یہودیوں کے حامی وفود کا حقائق اور اعداد و شمار کی زبان میں جرات مندانہ مقابلہ کیا۔

مگر روسی نمائندے نے پھر اٹھ کر کہا:

"فلسطین پر یہودیوں کا قانونی حق ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اس حق کے تحفظ کے لیے ہم ان کی مدد کریں، تاکہ اس علاقہ میں ان کے پاؤں جمیں اور وہ اپنی ریاست قائم کر سکیں۔ عربوں کو ہنگامے برپا کرنے اور تقریروں کا جوش دکھانے اور تاریخی دلائل کا سہارا لینے اور تنقید و تنقیص کے اسلوب اختیار کرنے سے باز آجانا چاہیئے۔"

یوگوسلاویہ کے نمائندے نے کہا:

"ہم فلسطین کی تقسیم کی تجویز قبول کر لینے کی دعوت دیتے ہیں۔ فلسطین یہودیوں اور عربوں دونوں کا وطن ہے۔ یہود اگر فلسطین کے اندر اشتراکی اور جمہوری نظام زندگی کو رواج دیں گے تو اس سے خود عربوں کو بھی استفادہ کا موقع ملے گا جو اس نظام کے شدید حاجتمند ہیں۔ عربوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ یہودیوں کی قربانیوں کی قدر کریں اور بے سود دشمنی سے دستبردار ہو جائیں۔"

برطانیہ کے نمائندے مسٹر الیگزنڈر کیڈوگن نے دخل دیتے ہوئے کہا:

"پُرامن حل وہ ہے جس پر دونوں فریق راضی ہو جائیں۔ عرب بھی اور یہودی بھی۔ نہ کہ صرف ایک ہی فریق۔ اقوام متحدہ کو قابلِ قبول حل تلاش کرنا چاہیئے۔ حکومتِ برطانیہ آپ کو یقین دلاتی ہے، کہ برطانیہ قرارداد تقسیم کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں اقوام متحدہ کی امداد کے لیے اپنی عسکری طاقت ہرگز استعمال نہیں کریگا۔"

روسی نمائندے تسارا پکین نے برطانوی نمائندے کی مخالفت کی اور کہا:

"برطانیہ کا رویہ معاملات کو الجھا رہا ہے اور اقوام متحدہ کی قرارداد کے نفاذ میں روڑے اٹکا رہا ہے۔ اگر برطانیہ تقسیم کے فیصلہ کو نافذ کرنے میں بے بس ہے تو ہم بہرحال قرارداد تقسیم کو عملی جامہ پہنانے میں قطعاً بے بس نہیں ہیں۔ ہم اسے روبکار لانے کے لیے پوری طرح کمربستہ ہیں۔"

پولینڈ کے نمائندے نے بھی عربوں پر حملہ کیا اور پاکستان کے نمائندے کے بھی لتے لیے۔ اس نے کہا:

"یہودی اپنے ملک فلسطین میں اپنی ریاست کی تشکیل کرنا چاہتے ہیں یہ ان کا قانونی حق ہے۔ عرب آخر ان کی عداوت میں کیوں بہے جا رہے ہیں اور پاکستان کو کیا آفت پڑی ہے کہ وہ یو۔این۔او کی تجویز کو ٹھکرا رہا ہے۔ عرب گوشِ ہوش سے سُن لیں کہ فلسطین تنہا ان کی ملکیت نہیں ہے۔ ہم عربوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس مسئلے کے حل کے سلسلے میں ہمارے ساتھ تعاون کا راستہ اختیار کریں، اسکا حل فضا کو خوشگوار بنانے میں مدد دیگا اور مشرق کو استعمار کے پنجے سے چھڑانے کے لیے عربوں اور یہودیوں کے درمیان مستحکم تعاون کی راہ ہموار کرے گا۔"[1]

۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کے اجلاس میں سیاسی جنگ عروج کو پہنچ گئی۔ قریب تھا کہ یہ جنگ قرار دادِ تقسیم پر رائے شماری کو ملتوی کر دینے اور کوئی دوسرا متبادل حل تلاش کرنے کی تجویز پر ختم ہو جاتی مگر اشتراکی بلاک کی ہٹ دھرمی اور تقسیم فلسطین پر اسکے شدید اصرار نے بنتی بات کو بگاڑ کر رکھ دیا۔ آخر کار سوویت بلاک کی خواہش، کوشش اور اصرار کے بعد اقوامِ متحدہ نے قرار دادِ تقسیم کو منظور کر لیا، اور دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ قرار داد صرف ایک ووٹ کی اکثریت سے کامیاب ہوئی۔ دنیا جانتی ہے کہ اقوامِ متحدہ سے فلسطین کی تجویز منظور کرانے میں امریکہ کی سازشوں اور اسکے دباؤ نے کیا کردار ادا کیا مگر اس بات پر پردہ پڑا ہوا ہے کہ اس میں روس اور اس کے کمیونسٹ بلاک کا کیا حصہ تھا۔

---

[1] سیاسی کمیٹی کی کارروائی (۲۵ اکتوبر - ۲۲ نومبر ۱۹۴۷ء)

اس منحوس قرارداد کے اعلان کے بعد اقوام متحدہ نے تقسیم کے کام کی نگرانی کے لیے ایک کمیٹی تشکیل کی۔ یہ کمیٹی ان پانچ ارکان پر مشتمل تھی (چیکوسلواکیہ، ڈنمارک، بولیویا فلپائن اور پاناما۔ جنرل اسمبلی نے سلامتی کونسل کو ہدایت کی کہ وہ تقسیم کی قرارداد کو نافذ کرنے کے لیے ہر ممکن تدبیر اختیار کرے اور اگر اسے بین الاقوامی فوج کے استعمال کی ضرورت ہو تو اس سے بھی دریغ نہ کرے۔ مگر بلیشیز اسکے کہ مذکورہ بالا بین الاقوامی کمیٹی فلسطین میں قدم رکھتی، وہاں عربوں اور یہودیوں کے درمیان خونریز فسادات بھڑک اٹھے اور اس خوفناک حد تک پھیل گئے کہ بعض مغربی ممالک، جن میں امریکہ سرِ فہرست تھا، تقسیم کے بارے میں اپنے رویّے کو تبدیل کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اس مرحلے پر سلامتی کونسل میں جو کچھ ہوا۔ اس کی روداد ملاحظہ ہو۔

مسئلہ فلسطین سلامتی کونسل میں :

سلامتی کونسل کے اجلاس سے تھوڑی دیر پہلے امریکی حکومت نے ایک خفیہ اجلاس میں جو ۱۹ مارچ ۱۹۴۸ء کو وہائٹ ہاؤس (واشنگٹن) میں منعقد ہوا تھا تقسیم فلسطین کی قرارداد سے دستبردار ہو جانے کا فیصلہ کیا اور طے کیا کہ فلسطین کو بین الاقوامی تولیت میں دینے کی تجویز زیر بحث لائی جائے۔ امریکی حکومت نے اپنے نمائندے مسٹر آسٹن کو ہدایت کی کہ وہ اس تجویز کو سرکاری طور پر کسی موزوں اجلاس میں پیش کرے امریکی نمائندے نے جب یہ تجویز سلامتی کونسل کے سامنے پیش کی تو روس کے نمائندے نے اس پر شدید ناراضی کا اظہار کیا اور کونسل سے اس تجویز کو مسترد کر دینے کا مطالبہ کیا۔ عرب نمائندوں نے بعض تحفظات کے ساتھ بین الاقوامی تولیت کی تجویز کی تائید کی۔ فرانس کے نمائندے نے کہا :

"میں اپنی حکومت کی طرف سے امریکی تجویز کی حمایت کرتا ہوں۔ اس لیے کہ تقسیم کا نظریہ جیسا کہ مسٹر آسٹن نے اپنے بیان میں واضح کیا ہے، انتہائی غلط ہے اور فلسطین کے پیچیدہ مسئلہ کو ہرگز حل نہیں کر سکتا۔"

مگر روس کا نمائندہ گرومیکو اس امریکی تجویز پر برس پڑا اس نے کہا۔

"نئی تجویزوں اور حلوں کی تلاش میں تضیع اوقات سے کچھ حاصل نہیں ہے۔ تقسیم ہی قابلِ قبول حل ہے۔ یہی حل یہودی قوم کو جو ماری ماری پھرتی ہے اور طرح طرح کے مصائب میں گھری ہوئی ہے۔ استقرار بخش سکتا ہے اور فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کی ضمانت دے سکتا ہے۔ سلامتی کونسل کو کسی ایسی قرارداد کے اندر ترمیم یا تبدیلی کا کوئی حق نہیں ہے۔ جسے جنرل اسمبلی منظور کر چکی ہو۔ امریکہ نے جو نئی تجویز پیش کی ہے یعنی تقسیم کے بجائے فلسطین کو بین الاقوامی تولیت میں دینے کی تجویز اس سے اس کا مقصد صرف عربوں کی خوشنودی حاصل کرنا ہے تاکہ امریکہ اپنے تیل کے مفادات کا تحفظ کر سکے[1]

غرض جس روز سے مسئلہ فلسطین اقوامِ متحدہ کے سامنے پیش ہوا، اس دن سے لے کر اسرائیل کے قیام اور قیام کے بعد کے عرصہ تک ہر مرحلہ میں روس اور کمیونسٹ بلاک لگاتار عربوں کی کھلم کھلا اور تند و تیز مخالفت کرتا رہا ہے اس سلسلے میں اشتراکی ممالک کا شدید اور تلخ ترحملہ وہ تھا جو ۱۹۴۸ء میں انہوں نے کیا تھا۔ سلامتی کونسل میں فلسطین کے حقِ خود ارادیت پر ایک فیصلہ کن معرکہ برپا تھا کہ روس نے بالآخر دخل اندازی کرتے

---

[1] ملاحظہ ہو سلامتی کونسل کی کارروائی (۵ و ۲۰ مارچ ۱۹۴۸ء)

ہوئے یہاں تک دھمکی دے دی کہ روس اسرائیل کی حفاظت اور امن کے تحفظ کی خاطر طاقت کے استعمال سے بھی دریغ نہیں کریگا۔

اس وقت فلسطینی قوم کی مدد کے لیے عرب ممالک کے متعدد دستے فلسطین میں داخل ہو رہے تھے۔ روسی مندوب نے ان دستوں کو بیرونی دخل اندازی قرار دیا۔ اس سلسلے میں اس نے سلامتی کونسل کے اندر جو تقریر کی اس کا ملخص یہ تھا:

"سلامتی کونسل کو چاہیئے کہ وہ فوراً بلا تاخیر عرب گوریلوں کو حکم دے کہ وہ فلسطین سے نکل جائیں۔ جب تک سرزمین فلسطین سے عرب گوریلے جنہوں نے فلسطین پر لشکر کشی کر کے جنگ کی آگ بھڑکا رکھی ہے واپس نہیں نکل جاتے اسوقت تک قیام امن کے لیے جنگ بندی کا کوئی فائدہ نہیں ہے یہودی قوم کی امداد اور فلسطین کے اندر اس کے حقوق کی حفاظت کے لیے ہم تمام ذرائع استعمال کرینگے"

۲۵ رمئی ۱۹۴۸ء کے اجلاس میں جو اسرائیل کے قیام کے اعلان اور فلسطین کی واگذاری کے لیے عرب افواج کے داخلے کے دوسرے ہی روز منعقد ہوا، شامی وفد کے قائد فارس بک الخوری نے ایک نہایت پرمغز تاریخی بیان دیا اور سلامتی کونسل کے سامنے حق اور انصاف کو اجاگر کرنے کی قابل قدر کوشش کی۔ مگر سلامتی کونسل کی فضا افترا پردازی، دھوکہ اور سیاسی چالبازیوں سے پوری طرح مسموم تھی۔ علامہ فارس الخوری نے اس سب کے باوجود ببانگ دہل کہا:

فلسطین کی سرزمین میں یہودیوں کی ایک جماعت استعمار کی پشت پناہی اور صہیونیت کی ریشہ دوانی سے داخل ہوئی۔ اس نے سازشوں کے ذریعہ سے اور بین الاقوامی چالبازیوں کے پردہ میں عرب قوم کو چیلنج کر دیا اور بزور طاقت

قدم جمانا شروع کر دیئے اس ظالمانہ چیلنج کے جواب میں عرب حکومتوں نے فلسطینی قوم کی آواز پر لبیک کہا اور اسکی دستگیری اور حق رسی کیلیے اٹھ کھڑی ہوئیں"

اسرائیل کو تسلیم کرنے میں مسابقت !

قرار داد تقسیم کے ہیروؤں نے صرف اقوام متحدہ سے یہ ظالمانہ قرار داد منوانے پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ اسے بزور طاقت نافذ کرنے کے لیے صہیونیوں کی پوری پوری مدد کی اور بالآخر جب ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو اسرائیل کے قیام کا اعلان ہوا تو اسکے دس منٹ بعد تل ابیب پر اس ریاست کو تسلیم کر لینے کے برقیوں کی بارش شروع ہو گئی۔ سب سے پہلا برقیہ جس میں اسرائیل کو تسلیم کیا گیا، امریکہ کے صدر ٹرومین کا تھا۔ اسکے چار منٹ بعد اسٹالن کا برقیہ پہنچ گیا اور پھر کمیونسٹ ممالک اور مغربی یورپ کے ممالک کے برقیے پہنچے۔ مغربی یورپ کے برقیوں میں سب سے پہلا برطانیہ کا برقیہ تھا۔ اسٹالن کا برقیہ جو اس وقت ماسکو ریڈیو نے نشر کیا تھا اور یورپ اور امریکہ کے اخبارات میں بھی چھپا اس لحاظ سے ممتاز اور منفرد برقیہ تھا کہ اس میں بڑے پرکشش اور ہمدردانہ اور حوصلہ افزا الفاظ میں اسرائیل کے فروغ کی خواہش ظاہر کی گئی تھی۔

امریکہ اور روس دونوں اسرائیل کے بانی ہیں۔

اس تاریخ سے یہ بات بالکل ناقابل انکار حد تک واضح ہے کہ بین الاقوامی طاقتوں نے مل کر اسرائیل کو جنم دیا ہے اور مغربی بلاک اور مشرقی بلاک (بزیر قیادت روس) دونوں نے اس میں ملی بھگت کا ثبوت دیا ہے۔ روس نے دراصل "دولت یہود" کے تصور کو اشتراکی بنیادوں پر جامۂ عمل پہنانے کی سعی کی اور اس معاملے میں اسکے پیش نظر اسی منصوبہ پر عملدرآمد کرنا تھا جو اشتراکی تحریک کے یہودی زعماء نے

وضع کیا تھا۔ یہی وہ زعماء تھے جنہوں نے لینن اور ٹراٹسکی کی قیادت میں خود روس کے بالشویک انقلاب کی منصوبہ بندی کی تھی۔ اسرائیل کے بارے میں بلاشبہ اس حد تک روس کا منصوبہ ضرور کامیاب ہوگیا کہ ایک یہودی ریاست وجود میں آگئی۔ مگر روس کی یہ کوشش سعیٔ ناکام ثابت ہوئی کہ یہ ریاست خالصتاً کمیونسٹ ریاست بن جائے۔ اس کی وجہ زعمائے صہیون کی یہ اسکیم ہے کہ صہیونیت کو بیک وقت کمیونزم اور مغربی سرمایہ داری، دونوں سے رشتہ برقرار رکھنا ہے اور دونوں سے اپنے مقاصد کی خدمت لینی ہے۔

اسرائیل اور اشتراکی ممالک کے دوستانہ معاہدے

اب ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اسرائیل کی یہودی ریاست قائم ہوجانے کے بعد اشتراکی ممالک نے اسے پروان چڑھانے کے لیے کیا کچھ کیا ہے۔ مشرقی کیمپ اور خاص طور پر سوویت یونین، یوگوسلاویہ، چیکوسلواکیہ اور رومانیہ نے اسرائیل کے ساتھ اقتصادی، ثقافتی اور فنی تعلقات کو قائم کرنے اور بڑھانے میں مغربی کیمپ سے ہمیشہ سبقت کی ہے۔ چنانچہ اسرائیل نے سب سے پہلا معاہدہ جو کسی بیرونی ملک کے ساتھ کیا وہ وہ معاہدہ تھا جو اسٹالن کے عہد میں سوویت یونین کے ساتھ کیا گیا۔ اس ابتدائی معاہدے کے بعد خروشیف کے دور میں پے در پے تجارتی، ثقافتی اور سیاسی معاہدات استوار کیے گئے۔ ان سب پر مستزاد وہ معاہدہ ہے جو بحری تجارت کے میدان میں اسرائیل سے کیا گیا ہے اور جس کی رُو سے روس کے تجارتی جہاز اسرائیلی بندرگاہوں کے لیے استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ اسرائیل بالفعل روسی جہازوں کے ذریعہ سے ہی ایشیا کی منڈیوں اور مشرقی یورپ اور افریقہ کے ممالک میں اپنی برآمدات منتقل کر رہا ہے۔ صرف ۱۹۶۴ء میں

اسرائیل اور روس کے درمیان تین معاہدات قائم ہوئے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے :

۱۔ تجارتی معاہدہ : اس معاہدے کی رُو سے دونوں ملکوں کے درمیان تجارتی اشیاء کے تبادلہ کو ترقی دی جائے گی ۔ روس اسرائیل سے فاسفیٹ، کیمیاوی اشیا اور پارچات خریدے گا۔ اور اسرائیل روس سے انجن، بجلی کے آلات اور پشم درآمد کرے گا تاکہ اپنے کارخانوں میں تیار کر کے اُسے یہودیوں کی تجارتی کمپنیوں کے ذریعہ مغربی یورپ اور امریکہ میں فروخت کرے ۔

۲۔ سیاحت کا معاہدہ : دونوں ملکوں کے درمیان سیاحت کو ترقی دی جائے گی اور اس میدان میں ہر طرح کی سہولتیں بیش از بیش فراہم کی جائیں گی ۔ روسی مزدوروں کے مابین روابط کو نشو و نما دیا جائے گا ۔ دونوں ملکوں میں فنکاروں، سائنس دانوں اور مصنفین کے باہمی تبادلہ اور دوروں کے لیے سالانہ پروگرام وضع کیے جائیں گے ۔ چنانچہ اسی معاہدہ کی رُو سے ۱۹۶۴ء میں ہزاروں روسی سیاح اسرائیل میں داخل ہوئے ہیں ۔ اور اُدھر یہودی نوجوانوں اور عمّال کے متعدد وفود سوویت یونین کا دورہ کر چکے ہیں ۔

۳۔ بحری نقل و حرکت کا معاہدہ : دونوں ملکوں کے درمیان مشترک بحری تجارت کی درآمد و برآمد میں پوری سہولتیں مہیا کی جائیں گی ۔ اسرائیل کے تجارتی جہازوں کو اجازت ہوگی کہ وہ سامان تجارت کو لادنے اور اُتارنے اور ایندھن حاصل کرنے کے لیے روسی بندرگاہوں کو استعمال کریں ۔ اس کے بالمقابل روس کا تجارتی بیڑہ اسرائیلی بندرگاہوں کے استعمال کا مجاز ہوگا ۔

اسرائیل اور روس کے مابین جتنے معاہدات ہوئے ہیں ان کی دیکھا دیکھی دوسرے اشتراکی ممالک نے بھی ۱۵ سالوں کے اندر اسرائیل کے ساتھ متعدد معاہدات استوار کیے ہیں ۔

ان ملکوں کے ساتھ اسرائیل کے معاہدات کا اجمالی بیان یہ ہے۔

یوگوسلاویہ کے ساتھ	۴ معاہدات	ابھی تک قائم اور جاری ہیں	
چیکوسلواکیہ کے ساتھ	۵	"	"	"
رومانیہ کے ساتھ	۴	"	"	"
بلغاریہ کے ساتھ	۳	"	"	"
پولینڈ کے ساتھ	۳	"	"	"
ہنگری کے ساتھ	۳	"	"	"

اشتراکی ممالک اسرائیل کی منڈی ہیں

اشتراکی ممالک کی ہر گونہ مدد کی بدولت، جس میں اسرائیلی مصنوعات کے لئے منڈیاں مہیا کرنا اور اسرائیل کو ہر نوعیت کے میکانکی آلات فراہم کرنا بھی شامل ہے، اسرائیل نے قلیل مدت میں ترقی کے کئی مراحل طے کر لیے اور اس کی پیداوار میں کئی گناہ اضافہ ہو گیا۔ یہ بات ہر خاص و عام کو معلوم ہے کہ اسرائیل اپنی فاضل زرعی پیداوار (پھل اور غلہ) کا ۶۰ فیصد، کیمیادی اشیاء کا ۴۰ فیصدی اور مختلف مصنوعات کا ۵۰ فیصد مشرقی یورپ کے ممالک اور روس کو برآمد کرتا ہے۔ ان ممالک میں یوگوسلاویہ پیش پیش ہے جس نے اسرائیل کے ساتھ پچھلے چند سالوں میں تجارتی تعلقات کو بڑی وسعت دی ہے۔ یعنی ۱۹۵۰ء تک اُس کے تعلقات کی جو نسبت تھی اُس کے بعد یہ نسبت تین گُنی بڑھ گئی۔

جو بات خاص طور پر توجہ طلب ہے وہ یہ ہے کہ اسرائیل اشتراکی بلاک سے جو اشیاء درآمد کرتا ہے اُن کا بڑا حصہ افریقہ اور ایشیا کے مختلف ممالک کو برآمد

کر دیتا ہے۔ اسرائیل کی اپنی مصنوعات کا بھی یہ حال ہے کہ جو افریقی ممالک اسرائیل کے ساتھ تجارتی اور فنی معاہدوں میں منسلک ہیں ان کی منڈیوں میں اسرائیلی مصنوعات کی بھرمار ہو رہی ہے۔ اور قریب قریب اسرائیلی مصنوعات نے منڈیوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔

اسرائیل کی صنعتی اور زرعی ترقی میں کمیونسٹ ممالک کا حصہ

صنعتی اور زراعتی پہلوؤں کو لیجیے۔ ایوان ہائے تجارت کے اعلامیوں اور بین الاقوامی صنعت کے اعداد و شمار، اور یورپ اور اسرائیل کے سرکاری ماخذ اور بین الاقوامی عالمی تجارت کی گائیڈ بکس کو دیکھنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسرائیل میں جتنے کارخانے قائم کیے گئے ہیں، اور اسرائیلی ماہرین زراعت کے میدان میں جتنی مشینری استعمال کر رہے ہیں اس کا بڑا حصہ کمیونسٹ بلاک سے اسرائیل نے درآمد کیا ہے اور کچھ مغربی یورپ اور امریکہ سے۔ ملاحظہ ہوں ذیل کے اعداد و شمار:

۱۹۵۰ء تا ۱۹۶۵ء	کل تعداد	کمیونسٹ بلاک سے درآمد کردہ	مغربی ممالک سے درآمد کردہ
شکر سازی کے کارخانے	۳	۲	۱
دودھ اور پنیر تیار کرنے کی فیکٹریاں	۱۲۵	۹۰	۳۵
رس نکالنے کی فیکٹریاں	۱۴	۸	۶
بیجوں کے تیل اور کھل صاف کرنے کے کارخانے	۱۰	۶	۴
فلور ملز	۵۰	۳۰	۲۰
پارچہ بافی کی ملیں	۹	۵	۴

۱۹۵۰ء تا ۱۹۶۵ء	کل تعداد	کمیونسٹ بلاک سے درآمد کردہ	مغربی ممالک سے درآمد کردہ
جوتے بنانے کی فیکٹریاں	۲۶	۹	۱۷
کیمیاوی کھاد کی فیکٹریاں	۲	۱	۱
مختلف کیمیاوی اشیاء کے کارخانے	۷	۳	۴
دواسازی کے کارخانے	۵	۲	۳
بجلی کا سامان تیار کرنے والی فیکٹریاں	۸	۳	۵
پاور ہاؤس	۷۰۰	۵۰۰	۲۰۰
لکڑی کے کام کی ورکشاپیں	۵۰	۳۵	۱۵
سیمنٹ کی فیکٹریاں	۴	۳	۱
گلاس فیکٹریاں	۳	۲	۱
پٹرول صاف کرنے کے کارخانے	۲	۰	۲
زرعی ٹریکٹر وغیرہ	۲۰۰۰	۱۵۰۰	۵۰۰
غلہ کاٹنے اور گاہنے کی مشینیں	۳۰۰۰	۲۰۰۰	۱۰۰۰

ان اعداد و شمار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسرائیل کی صنعتی ترقی کا دارومدار امریکہ اور مغربی یورپ کی بافراط امداد کے علاوہ روس اور وارسا پیکٹ سے وابستہ کمیونسٹ ممالک پر ہے۔ یہ بات بھی خلافِ حقیقت نہیں ہے کہ اسرائیل نے مغربی کیمپ سے خوب خوب فوائد حاصل کیے ہیں۔ خاص طور پر امریکہ ہر سال مشرقِ اوسط اور افریقی ممالک اور ایشیا کی بعض پسماندہ ریاستوں کو جو امداد بھیجتا ہے اسرائیل بھی اُس سے خاطر خواہ

حصہ لیتا ہے۔ اسرائیل کے اکثر و بیشتر آبی منصوبے جنہیں وہ مکمل کر چکا ہے، بیختر شاہراہیں، زرعی اصلاحات اور معدنی دولت کی تلاش و تحقیق (جسے وہ دریافت کر چکا ہے اور اس سے استفادہ کر رہا ہے) ان تمام مدّوں کو اس نے امریکی امداد اور امریکہ اور یورپ کی یہودی کمپنیوں اور تنظیموں کے عطیات سے پایہ تکمیل تک پہنچایا ہے۔

اسرائیل اور سوشلزم

یہ کوئی نیا راز نہیں ہے کہ اسرائیل جب سے وجود میں آیا ہے اُس کی زمامِ اقتدار سوشلسٹ لیبر پارٹی کے ہاتھ میں رہی ہے۔ یہ پارٹی "مابی" کے نام سے مشہور ہے۔ اور اسے اُن یہودی عناصر نے تشکیل کیا ہے جو مشرقی یورپ کی اشتراکی تحریک سے وابستہ ہیں۔ اس کا پارٹی کا موجودہ سربراہ لیوی اشکول ہے جو اس وقت اسرائیل کا وزیر اعظم ہے۔ اس پارٹی کا بنیادی ستون وہاں کی لیبر فیڈریشن (ہسٹدروٹ) ہے جس میں اسرائیلی مزدوروں کی مجموعی تعداد کا ۶۵ اور ۷۰ فیصد حصہ شامل ہے۔ بائیں بازو کی ایک اور سوشلسٹ پارٹی بھی ہے جسے "احدوث ہاودا" کہا جاتا ہے۔ جو لیبر یونینوں کے کچھ گروہوں پر مشتمل ہے۔ ایک نئی پارٹی وجود میں آئی ہے جو دراصل مابی پارٹی سے الگ ہو جانے والے عنصر نے تشکیل کی ہے، اس کا نام "رافی" ہے اور اس کی قیادت بن گوریاں کے ہاتھ میں ہے۔ سب سے خطرناک پارٹی "جیروت" ہے جو بائیں بازو کے انتہا پسند گروہوں کی نمائندہ ہے۔ دوسرے درجہ پر لیبر پارٹی اغودات ہے اور تیسرے درجہ پر "حزب مزراحی"۔ ان تمام پارٹیوں کے قائدین اور مشرقی کیمپ کی حکمران کمیونسٹ پارٹیوں کے رہنماؤں کے درمیان متعدد وطنی، نسلی، فکری اور مشترکہ مفادات کے رشتے پائے جاتے ہیں۔ دراصل اسرائیل ایک سوشلسٹ اسٹیٹ

ہے ۔ اسرائیل کے حکمران وہ لوگ ہیں جو یورپ کے اشتراکی ممالک سے ہجرت کر کے فلسطین میں آباد ہوئے ہیں۔ اسرائیل کا طویل المیعاد منصوبہ جسے وہ کبھی اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا اس ریاست کی حدود کو فرات سے نیل تک توسیع کرنا ہے۔

اسرائیل کے مہاجرین میں کمیونسٹ ممالک کا تناسب

ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ اسرائیل کی آبادی کی اکثریت اشتراکی ممالک کے لوگوں پر مشتمل ہے۔ اور ۲۵ لاکھ کی آبادی میں ان لوگوں کا تناسب یہ ہے:

۵،۶۰،۰۰۰ دا	روس اور مشرقی یورپ کے علاقوں سے آنے والے
۳،۵۰،۰۰۰	ایشیائی اور افریقی ممالک سے آنے والے
۳،۰۰،۰۰۰	مغربی یورپ کے مہاجرین
۷۰،۰۰۰	شمالی اور لاطینی امریکہ کے مہاجرین
۲،۲۰،۰۰۰	عرب ممالک کے یہودی

ماسکو اسرائیل کے بقا کا حریص ہے

ہم علانیہ کہتے ہیں کہ روس نے اسرائیل کے بارے میں جو موقف اختیار کر رکھا ہے وہ سیاسی نقشے کے لحاظ سے اس رویّے سے ہرگز مختلف نہیں ہے جس کا امریکہ نے مظاہرہ کیا ہے۔ دونوں اسرائیل کے وجود کو قائم رکھنے کے حریص ہیں۔ دونوں نے مل کر اُس کی صنعتی ترقی میں حصّہ لیا ہے اور سرزمینِ عرب پر اُس کے پاؤں جمانے کی کوشش کی ہے۔ روس اور اشتراکی بلاک اسرائیل کے بقاو دوام کا کیوں شدّت سے حریص ہے، اس کے تین بنیادی اسباب ہیں:

اولاً: اسرائیل اشتراکی بنیادوں پر قائم ہوا ہے اور اس کی اکثر آبادی اشتراکی ممالک کے

لوگوں پر مشتمل ہے۔

ثانیاً: اسرائیل کا وجود اُن عربوں کو، جو اشتراکیت کے ہوا خواہ ہیں، مجبور کرتا رہے گا کہ وہ مشرقی بلاک کی حکومتوں سے تعاون کرتے رہیں اور اس کی تجارتی منڈیوں سے وابستہ رہیں۔

ثالثاً: دوسرے مادّی، سیاسی اور نظریاتی مفادات حاصل کرنے کے لیے۔

عربوں سے روس کی دوستی کی اصل بنیاد

اس بات سے انکار نہیں ہے کہ اشتراکی ممالک کلاسیک سامراج کی مخالفت کرتے ہیں اور براہِ راست یا بالواسطہ ہر طرح کے وسائل و ذرائع سے اس کے خلاف معرکہ آرا ہیں۔ اسی پُر فریب پالیسی نے بعض عربوں کو اس خوش فہمی میں مبتلا کر دیا ہے کہ اشتراکی ممالک اُن کے حامی ہیں اور صہیونیوں کے چنگل سے فلسطین کی واگزاری میں اُن کے ساتھ شریک ہیں۔ مگر ۱۹۵۶ء کے حالات و واقعات اور اب جون ۱۹۶۷ء کے واقعات نے یہ مُبرہن کر دیا ہے کہ مشرقی کیمپ نے ماسکو کی زیر دست اشتراکیت نواز عرب ریاستوں سے جتنے رشتے بھی قائم کیے ہیں وہ اس بنیاد پر نہیں کیے ہیں کہ اسرائیل کے وجود کو محو کر دیا جائے گا، بلکہ خالص مصلحت پرستی کے نقطۂ نظر سے قائم کیے ہیں، جس کا ماحصل یہ ہے کہ اشتراکی انقلاب کی دعوت کی اشاعت ہو جائے، اور عرب دنیا میں سستے طریقے سے اشتراکی فلسفہ و نظام کی جڑیں مضبوط کی جائیں اور اپنی مصنوعات کی کھپت کے لیے عرب ممالک کی منڈیوں سے استفادہ کیا جائے۔ خود روسی لیڈر بارہا یہ اعلان کر چکے ہیں کہ وہ عربوں کو جو کچھ امداد دے رہے ہیں وہ اس لیے نہیں ہے کہ اسرائیل کو منہدم کیا جائے بلکہ اس لیے ہے کہ عرب دنیا میں اشتراکی رجحان کو مضبوط کیا جائے

اور عربوں اور اسرائیل کے مابین پُرامن بقائے باہم کی فضا پیدا کی جائے، یعنی عرب فلسطین پر یہودی قبضے کو تسلیم کر لیں اور آئندہ ان میں لڑائی نہ ہو۔

اشتراکی کیمپ کی طرف سے عربوں کی امداد کی حقیقت

بلاشبہ روس اور اشتراکی بلاک نے اشتراکیت زدہ عرب ملکوں کی بھی مدد کی ہے، مگر یہ امر واقعہ ہے کہ اس نے مصر، شام اور الجزائر کو آج تک جو امداد دی ہے وہ اُس امداد کا ایک فیصد بھی نہیں ہے جو اُس نے اسرائیل کو دی ہے۔ اسرائیل نے صنعتی ترقی کا قصر روس اور مشرقی یورپ کی امداد سے تعمیر کیا ہے اور عسکری طاقت مغربی بلاک کی امداد سے فراہم کی ہے۔ بخلاف اس کے عربوں نے اشتراکی کیمپ سے جو اسلحہ بھی حاصل کیا ہے اُسے اپنے سرمائے سے خریدا ہے یا پھر اُن قرضوں سے خریدا ہے جو انہوں نے اپنے بعض منصوبوں کی تکمیل کے لیے مانگے تھے اور جو ہر صورت واجب الادا ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ عربوں کو جو امداد، اسلحہ اور قرض ملا ہے اُسے تو مشرق و مغرب کے پریس نے خوب اچھالا ہے اور اُس کے اعداد و شمار سے دنیا بھر کو اطلاع دی ہے۔ مگر اسرائیل کو جو امداد دی گئی ہے اشتراکی کیمپ نے اُسے دانستہ پردۂ راز میں رکھا ہے تاکہ عربوں کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچے اور عربوں سے اُس کے دوستانہ تعلقات متاثر نہ ہوں۔ اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ جون ۶۷ء کی جنگ سے پہلے امریکہ اور روس دونوں نے مصر کو اسرائیل پر حملہ کرنے سے روکا تھا، درآنحالیکہ دونوں کو یہ معلوم تھا کہ اسرائیل ۵ جون کو مصر پر حملہ کرنے والا ہے۔ پھر اس جنگ میں شکست کھانے کے بعد مصر کو روس سے جتنے ہتھیار بھی ملے ہیں وہ حملہ کے نہیں بلکہ صرف مدافعت کے ہتھیار ہیں، حالانکہ اسرائیل کو مغربی ملکوں سے جو ہتھیار مل رہے ہیں وہ سب کو

معلوم ہے کہ حملہ کے ہتھیار ہیں۔ مزید برآں یہ بات بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ روس اپنے زیر دست اشتراکی عرب ممالک کو سختی کے ساتھ اس بات پر مجبور کر رہا ہے کہ وہ اپنے کھوئے ہوئے علاقے حاصل کرنے کے لیے صرف سیاسی سمجھوتے پر اکتفا کریں اور لڑنے کا نام نہ لیں۔ حالانکہ وہ یہ بات خوب جانتا ہے کہ سیاسی ذرائع سے اسرائیل عرب سرزمین کا ایک انچ بھی واپس نہ دے گا۔

اسرائیل کو تیل کہاں سے ملتا ہے؟

ایک خاص پہلو جس پر کسی اہل قلم نے آج تک گفتگو نہیں کی اور نہ ثقہ شہادتوں کی روشنی میں اُسے حل کرنے کی کوشش کی ہے وہ یہ ہے کہ اسرائیل کو پٹرول کہاں سے ملتا ہے اور کیسے ملتا ہے؟ جس طرح مسئلہ فلسطین اور دوسرے عرب مسائل مثلاً اتحادِ عرب وغیرہ کے بارے میں عرب عوام کے ذہنوں میں غلط تصورات بیٹھ چکے ہیں، اسی طرح اسرائیل کے پٹرول کے ذرائع کے بارے میں بھی طرح طرح کی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ اس بارے میں ہمیں تین نقطۂ نظر ملتے ہیں۔ ہر نقطۂ نظر کا علمبردار گروہ اطلاعات کے ایسے ماٰخذ کے بل پر اپنے موقف کی بنیاد استوار کرتا ہے جنہوں نے پچھلے دس سالوں کے عرصہ میں صحیح رہنمائی اور عوام کی تربیت کے بارے میں کوہ قامت غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے ایک گروہ کا خیال ہے کہ ایران اسرائیل کو پٹرول دیتا ہے، دوسرا گروہ اس رائے کا علمبردار ہے کہ اسرائیل خلیج عربی کی ریاستوں سے پٹرول حاصل کرتا ہے، اور تیسرے گروہ کا جواب یہ ہے کہ صرف امریکی اور برطانوی کمپنیاں ہی صہیونی ریاست کو عربی پٹرول کی سپلائی کرتی چلی آرہی ہیں۔

لیکن ہمارے پاس تین ایسے ثقہ ذرائع ہیں جن کی بنیاد پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اوپر

جو کچھ بیان کیا گیا ہے امر واقع اس کے برعکس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۹۴۸ء میں جب عراق کا پٹرول، جو کرکوک سے حیفا تک پائپ لائن کے ذریعہ جاتا تھا، منقطع کر دیا گیا تو اس کے بعد اسرائیل نے رومانیہ سے پٹرول کی امداد طلب کی۔ کیونکہ رومانیہ تیل کی دولت سے مالا مال ہے۔ اور رومانیہ اسرائیل کا گہرا دوست سمجھا جاتا ہے۔ اسرائیل کے ساتھ رومانیہ کے مضبوط روابط قائم ہیں اور بے شمار اقتصادی، تجارتی، ثقافتی اور فنی رشتوں میں دونوں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ ماسکو کے اشارے پر رومانیہ نے عراقی پٹرول بند ہوتے ہی اپنے دوست اسرائیل کو بافراط پٹرول کی سپلائی جاری کر دی[1]۔

۱۹۵۵ء میں روس نے اسرائیل کو ۵۰ ملین ڈالر کا قرض اس غرض کے لیے دیا کہ اسرائیل اپنی ضرورت کا تیل روس سے خرید سکے۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا قرض تھا جو ماسکو نے ایک بیرونی ملک کو پیش کیا[2]۔

۱۹۶۱ء میں اسرائیل نے تیل کا ذخیرہ کرنے کے لیے اٹلی کی تیل کمپنی امینی سے بھاری بھرکم مقدار حاصل کی، یہ کمپنی مغربی یورپ کی وہ واحد کمپنی ہے جو روس سے تیل درآمد کرتی ہے اور اُسے اٹلی میں اور چند افریقی ممالک میں فروخت کرتی ہے۔

پانچ سال سے اسرائیل نے خود صحرائے نقب سے تیل نکالنا شروع کر دیا ہے۔ صحرائے نقب کا تیل اُس کی سالانہ ضرورت کا ۳۵ - ۴۰ فیصد پورا کر دیتا ہے۔ اور بقیہ ضرورت وہ بیرونی تیل سے پوری کرتا ہے[3]۔

---

[1] ملاحظہ ہو اقتصادی مطالعہ کے دفتر کی رپورٹ (روم ۱۹۴۹ء)

[2] ملاحظہ ہو جنرل فاؤنڈیشن برائے تجارتِ خارجہ کی رپورٹ (بروکسل ۱۹۵۵ء)

[3] ملاحظہ ہو اقتصادی تحقیقات کے دفتر کی رپورٹ (پیرس ۱۹۶۳ء)

اسرائیل کی سیاست ماسکو کی خواہش سے ہم آہنگ ہے۔

سیاسی میدان میں اسرائیل مغربی کیمپ سے گہرے تعلقات اور اس سے ہمہ گونہ امداد حاصل کرنے کے باوجود ایسی پالیسی پر گامزن ہے جس کے بنیادی اور اہم نکات روس کی خواہش کی ہمنوائی کرتے ہیں۔ اس پالیسی کے تحت اسرائیل نے روس کے حسبِ ذیل مطالبات کو کماحقہٗ پورا کیا ہے:

۱۔ اسرائیل آج تک مغرب کے کسی ایسے سیاسی یا عسکری معاہدے میں شامل نہیں ہوا جو اشتراکی بلاک سے جس کا قائد ماسکو ہے، متصادم ہوتا ہو۔

۲۔ امریکہ کی مخالفت کے باوجود اسرائیل نے چین میں ماؤزے تنگ کے نظام کو تسلیم کیا۔

۳۔ اسرائیل نے پولینڈ کی نئی حدود کو تسلیم کر لیا، جس کے معنی یہ ہیں کہ جرمنی اپنے مشرقی علاقوں سے مستقل طور پر محروم ہو جائے گا اور وہ علاقے پولینڈ کا حصہ تسلیم کیے جائیں گے۔ اسرائیل کے اس اعتراف سے مغربی یورپ میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی ہے اور جرمن حلقوں میں صہیونیوں کے خلاف شدید انتقامی جذبات ابھر آئے ہیں۔ کیونکہ پولینڈ کی نئی حدود کو روس اور وارسا پیکٹ کے ممالک اور اسرائیل کے سوا کسی نے ابھی تک تسلیم نہیں کیا ہے۔

۴۔ اسرائیل ماسکو کے نقشۂ سیاست کی غیر مشروط حمایت کرتا رہتا ہے۔ خاص طور پر برلن کے معاملہ میں اور جرمن قوم کے اتحاد کی مخالفت کے بارے میں۔

۵۔ مسئلہ کشمیر کے بارے میں اسرائیل اشتراکی کیمپ کا ہمنوا رہا ہے۔

۶۔ اسرائیل کی تمام بائیں بازو کی پارٹیاں اور مزدوروں کی تنظیمیں ان تمام کانفرنسوں میں شرکت کرتی ہیں جو ماسکو، پراگ، صوفیا، بلغراد، بوڈاپسٹ اور وارسا میں

منعقد ہوتی ہیں اور پُرامن بقائے باہم اور استعمار اور ان تمام نظریات کی بیخ کنی کے منصوبے بناتی ہیں جو اُن کی نگاہ میں "رجعت پسندانہ" ہوتے ہیں۔

رُوس کی طرف سے پُرامن بقائے باہم کی دعوت

جہاں تک عرب ممالک کا تعلق ہے روس نے پہلی مرتبہ ۱۹۵۵ء کے اوائل میں اِس علاقہ میں اپنے اثرات پھیلانے شروع کیے ہیں۔ اس وقت سے رُوس نے اس علاقے سے متعلق اپنی پالیسی کو سائنٹفک سوشلزم (مارکسزم) کی دعوت اور عربوں اور اسرائیل کے مابین پُرامن بقائے باہم کی بنیاد پر وضع کر رکھا ہے۔ بقائے باہم کے دوسرے معنی اسرائیل کو تسلیم کرنے اور اس سے صلح کر لینے کے ہیں، اور صلح کا نقطۂ آغاز یہ ہے کہ عرب فلسطین پر اسرائیل کے قبضے کو جائز مان لیں۔ اس سے یہ واضح ہوا کہ دنیائے عرب میں بقائے باہم کی جو دعوت پھیلائی جا رہی ہے اور مختلف عنوانوں سے اس ملعون نظریے کی اشاعت کی جا رہی ہے اس کا مقصدِ وحید ایسے "پُرامن حالات" پیدا کرنا ہے جو اس دعوت اور نظریے کو بروئے کار لانے میں ممد و معاون ہو سکتے ہوں۔ یہ حقیقت خود روسی لیڈروں نے ہر موقع و مناسبت پر واضح کی ہے اور اُن تمام کانفرنسوں میں اس کی صدائے بازگشت سُنی گئی ہے جو ماسکو میں ۱۹۵۶ء، ۱۹۵۹ء، ۱۹۶۱ء، ۱۹۶۴ء اور ۱۹۶۶ء میں منعقد ہو چکی ہیں۔ خروشیف نے جب ۶ مئی ۱۹۶۴ء کو قاہرہ کا دورہ کیا تھا تو اس نے صدر جمال عبدالناصر کو "ہیرو آف روس" کا خطاب دیتے ہوئے صراحت سے کہا تھا:

"سوویت یونین کی حکومت پُرامن بقائے باہم کے اصُول کی پابند ہے اور اس پر قائم ہے عربوں کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ اس علاقے

میں امن کی ضمانت فراہم کرنے اور اس علاقے کی تمام اقوام کے ساتھ پُرامن زندگی بسر کرنے کے لیے اس اصول کو اپنی سیاستِ خارجہ کا محور بنائیں۔ علاقے کی اقوام سے مراد عرب اور اسرائیل ہیں۔"

خروشچیف نے عرب قومیت پر بھی شدید تنقید کی اور کہا:

"اشتراکیت کسی قومی نظریے کو تسلیم نہیں کرتی۔ اشتراکیت مزدوروں اور کسانوں کے اتحاد کی علمبردار ہے۔۔۔"

خروشچیف کے بعد کوسیجن اور برزینیف اور پڈگورنی نے بھی روس کی اس پالیسی کی توثیق کی ہے اور کہا ہے کہ:

"روس پُرامن بقائے باہم کے راستے کا پابند ہے اور اسی بنیاد پر وہ ترقی پسندانہ (یعنی اشتراکی) تحریکوں کا پرجوش حامی اور مؤید ہے۔"[1]

کمیونسٹ حلقوں کی طرف سے آزادیٔ فلسطین کا کبھی مطالبہ نہیں کیا گیا

جو بات عرب عوام کو خاص طور پر معلوم ہونی چاہیئے، اور جسے عرب پریس نے عوام کو بتانے کی کبھی زحمت گوارا نہیں کی وہ یہ ہے:

الف: جس روز سے اسرائیل کے منحوس وجود نے جنم لیا ہے اس روز سے آج تک ماسکو یا کمیونسٹ بلاک کے دوسرے شہروں میں کمیونسٹ پارٹیوں اور بائیں بازو کی جماعتوں کی جتنی کانفرنسیں اور اجتماعات ہوئے ہیں اُن کے پورے ریکارڈ میں

---

[1] ملاحظہ ہو: روس کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کی رپورٹ۔ مطبوعہ ماسکو، ۲۹ مارچ ۱۹۶۶ء۔

کسی ایسی سفارش یا قرار داد کا نشان نہیں ملتا جس میں فلسطین کا ذکر ہو، یا فلسطین کو عرب علاقہ کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہو، یا فلسطین کی آزادی کی طرف اشارہ کیا گیا ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ ایسی بھی کوئی سفارش یا اپیل یا قرار داد نہیں ملتی جس میں اسرائیل کے وجود پر کوئی مخالفانہ کلمہ کہا گیا ہو، یا اس کے توسیعی منصوبوں کی مذمت کی گئی ہو۔

ب: "افریشیائی تنظیم" کی کانفرنسوں میں بھی جو قرار دادیں پاس کی گئی ہیں اُن کی پوری رُودادوں میں ایسی کوئی قرار داد موجود نہیں ہے جو مثبت انداز میں فلسطین کو یہودیوں سے آزاد کرانے کے نظریہ کی حمایت کرتی ہو، اور اسرائیل کو استعمار کی تخلیق کردہ غیر قانونی ریاست تصور کرتی ہو۔ "افریشیائی تنظیم" نے جس کا مستقل مرکز قاہرہ میں ہے اپنی تمام سفارشات اور قرار دادوں کے اندر مسئلہ فلسطین کے بارے میں حد سے حد جو باتیں کہی ہیں وہ اس طرح کے رسمی الفاظ میں ادا کی گئی ہیں: "عرب پناہ گزینوں کی بحالی کا حق" ــــ "اقوام متحدہ کی قرار دادوں کی پابندی ــ"

ج: بلگانن، خروشیف اور کوسیجن، تینوں کے عہد میں عرب حکمرانوں نے روسی زعماء کے ساتھ جتنے سیاسی اور اقتصادی مذاکرات کیے ہیں اور ان کے خاتمہ پر جتنے مشترکہ بیانات جاری کیے گئے اُن میں سے کسی بیان میں آج تک فلسطین کی آزادی کا کبھی ذکر نہیں آیا ہے اور نہ کسی ایسی ذمّہ داری کا عہد کیا گیا ہے جس کی رو سے ماسکو فلسطین پر عربوں کے حق کی بحالی کے لیے ان کی مدد کرنے کا پابند ہوتا ہو۔ ان تمام بیانات میں مسئلہ فلسطین کے بارے میں اس سے زیادہ کسی جذبے کا اظہار نہیں کیا گیا ہے کہ: "فلسطینی عربوں کے حقوق کی حمایت کی جاتی ہے۔"

حمایت کا جو مفہوم ماسکو کے پیش نظر ہے وہ یہ نہیں ہے کہ ماسکو ان حقوق کی بحالی میں حصہ لے گا یا فلسطین کو یہودیوں سے آزاد کرانے کی موافقت کرے گا بلکہ صرف یہ ہے کہ وہ اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کے تحت مہاجرین کے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کرے گا۔

عرب پریس کا گمراہانہ پروپیگنڈا

جعل سازی، فریب دہی اور تحریف و تضلیل کے ہتھکنڈوں نے عرب تاریخ کے نازک سے نازک مراحل میں بھی انتہائی خطرناک اور نقصان دہ کردار ادا کیا ہے۔ دوسری طرف سیاسی اور نظریاتی تشدد نے اربابِ فکر و سیاست اور آزاد اہلِ قلم کے حلقوں میں ایسی خوفناک فضا پیدا کیے رکھی ہے کہ حقیقت کی جستجو اور حقیقت کے اظہار کا ہر جذبہ اپنی موت مر گیا۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں، اگرچہ یہ کہتے ہوئے بڑا دکھ ہوتا ہے کہ عرب رائے عامہ کو گمراہ کرنے میں ان لوگوں نے تمام سابقہ ریکارڈ مات کر دیئے ہیں۔ اس دعوے کے ثبوت میں بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

۱۔ عرب پریس سالہا سال سے عرب عوام کو یہ یقین دلاتا رہا ہے کہ روس نے اپنے عرب اشتراکی دوستوں سے یہ عہد کر رکھا ہے کہ عربوں پر جب کبھی حملہ ہوگا روس اُسے ناکام کرنے کے لیے عملی اقدامات کرے گا۔ نیز اُس نے یہ ذمہ داری بھی اپنے سر لے رکھی ہے کہ وہ فلسطین کی جنگِ آزادی میں عربوں کے دوش بدوش شرکت کرے گا۔ مگر ۵ رجون ۱۹۶۷ء کو بلّی تھیلے سے باہر آگئی اور روس کا حقیقی رویّہ طشت از بام ہو گیا۔ رُوس نے اس تباہ کُن جنگ میں اسرائیلی جارحیت کو فنا کرنے کے عملی اقدامات کے بجائے صرف کھوکھلے بیانات پر اکتفا کیا۔ ہمیں رُوس

کے اس رویّے پر انگشتِ حیرت منہ میں لینے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے اور نہ روس کو کوئی ملامت ہی کی جانی چاہیئے۔ کیونکہ روس نے عربوں کے ساتھ اپنے دوستانہ تعلقات کبھی اس بنیاد پر استوار نہیں کیے تھے کہ وہ صہیونیت کی بیخ کنی کے لیے عربوں کی دستگیری کرے گا یا فلسطین کے اندر عربوں کو ان کا حق واپس دلائے گا۔ روس کو بھی مغربی ممالک کی طرح عربوں کی دوستی سے اس کے سوا اور کوئی سروکار نہیں ہے کہ وہ عرب ممالک میں اپنے مفادات کی حفاظت کر سکے اور اپنے سیاسی اثرات کو زیادہ سے زیادہ پھیلا سکے۔ لہٰذا یہ روس کا نہیں بلکہ عرب پروپیگنڈہ بازوں کا قصور ہے کہ انہوں نے خود اپنی ہوا باندھنے کے لیے عرب عوام میں روس کے متعلق بے بنیاد توقعات پیدا کیں۔

۲۔ عرب پریس نے اقوام کے ذہنوں میں دشمن کی طاقت اور اس کی فوجی تیاریوں اور اس کے اقتصادی اور سیاسی حالات کے بارے میں بلا تحقیق غلط اندازے بٹھائے۔ یہاں تک کہ جنگ سے صرف چار ہفتے قبل اس بارے میں مغالطہ انگیز اور من گھڑت اعداد و شمار شائع کیے جن سے عرب عوام مطمئن ہو گئے کہ اسرائیل شدید اقتصادی بحران میں گھرا ہوا ہے۔ اسرائیل میں بے روزگاروں کی تعداد صرف شہری مزدوروں کے اندر ۹۶ ہزار تک پہنچ گئی ہے۔ ان یہودیوں کی تعداد میں کئی گنا اضافہ ہو گیا ہے جو اسرائیل سے مغربی یورپ اور امریکہ واپس جا رہے ہیں۔ اسرائیل کی فوج جس کی کل تعداد مردوں اور عورتوں سمیت ۲ لاکھ ہے، اس کے پاس جتنے جہاز، ٹینک اور توپیں ہیں وہ تمام عرب

افواج کے مجموعی اسلحہ کے مقابلے میں صرف ۲۰ اور ۲۳ فیصد ہیں۔ ان غلط معلومات اور بے بنیاد اندازوں نے جنگی مہم پر گہرا اثر ڈالا اور عرب اپنے دشمن پر غلبہ پانے کے لیے ضروری تیاری نہ کر سکے۔

۳۔ عرب پریس کے قابو یافتہ پروپیگنڈے نے ایک نقصان یہ بھی کیا کہ ان شخصیتوں کو جو اقوام متحدہ میں فلسطین کے متعلق عربوں کے نقطۂ نظر کی ہمیشہ مخالف رہی ہیں، اور ان شخصیتوں کو جن کے اسرائیل کے ساتھ گہرے فکری اور سیاسی روابط رہے ہیں، عرب کا دوست بنا کر متعارف کرایا ہے۔ بے شک عرب قوم کو دوسری اقوام اور افراد کی دوستی کی بے حد ضرورت ہے۔ جن جن اقوام سے عربوں کی دوستی ہے اُسے مزید ترقی دینا چاہیئے۔ لیکن نڈر عرب قوم کو کھوکھلے مظاہر اور خوشنما الفاظ کے دھوکے میں مبتلا کرنا کسی طور پر جائز نہیں ہے۔ امریکہ بلاشبہ عربوں کے مفاد کا دشمن ہے اس سے ضرور ان کو خبردار کیجئے۔ مگر روس بھی عربی مفاد کا حامی اور دوست نہیں ہے۔ اس کے متعلق عربوں کو دھوکے میں رکھنا صریح ظلم ہے۔

۴۔ ایک اور اہم پہلو ایسا ہے جس کی طرف عرب عوام کی توجہ مبذول نہیں کرائی گئی، وہ یہ ہے کہ اسرائیل میں اس وقت جو سائنس دان ایٹمی تحقیقات کے میدان میں کام کر رہے ہیں اُن کے درمیان اور امریکہ اور روس کے ایٹمی سائنسدانوں کے درمیان نہایت گہرا تعاون پایا جاتا ہے۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ امریکہ کے چند یہودی سائنسدانوں نے ہی روس تک ایٹمی راز منتقل کیے ہیں۔ اُدھر روس نے سائنسی تحقیقات کے میدان میں اسرائیل کے ساتھ ہر

نوعیّت کے تعلقات قائم کر رکھے ہیں اور ایٹم کے مشہور یہودی سائنسدان ڈاکٹر لانڈا اور روسی یونیورسٹیوں کے دوسرے اساتذہ کو اسرائیل کے تصرف میں دے رکھا ہے۔

(مصنف نے اس مضمون کی تیاری میں جن مآخذ سے استفادہ کیا ہے۔ اُن کی اپنی تشریح کے مطابق وہ درج ذیل ہیں۔)

۱۔ اقوامِ متحدہ کے اجلاسوں کی کارروائیاں۔

۲۔ بین الاقوامی مشنوں کی رپورٹیں۔

۳۔ اسرائیل اور اشتراکی ممالک کے درمیان معاہدات کی دستاویزات۔

۴۔ یورپ اور امریکہ کے یہودی اداروں کے اعلامیے۔

۵۔ بین الاقوامی دستاویزات اور تعلقات کی "انسائیکلوپیڈیا" طبع اوّل برلن ۱۹۳۸ء

۶۔ "صیہونی تحریک کی تاریخ" پیرس ۱۹۵۰ء

۷۔ حاییم وائسمین کی ڈائری: "مشرق کی بیداری اور صیہونی تحریک" مؤلفہ جوزف ہیٹیلے۔ میڈرڈ ۱۹۴۶ء

۸۔ "صیہونیت اور بالشویک انقلاب"، مؤلفہ پروفیسر سانٹینے، میلانو ۱۹۲۶ء

۹۔ "عالمی جنگ کے چند راز" مؤلفہ اندرے لبنو، پیرس ۱۹۲۴ء

۱۰۔ "موعودہ سرزمین کی طرف" مؤلفہ پروفیسر زانڈا، پراگ ۱۹۳۷ء

۱۱۔ "سٹالن سے والسمین تک"۔ مؤلفہ ارمانڈ شنیٹر، پیرس سنہ ۱۹۳۹ء
۱۲۔ "یالٹا سے پوٹسڈم تک" مؤلفہ جان سوریل، سان فرانسسکو، سنہ ۱۹۴۷ء
۱۳۔ سٹیٹینیوس (روزویلیٹ حکومت کے وزیر خارجہ) کی ڈائری۔
۱۴۔ ماسکو، صوفیا پراگ وغیرہ کی کمیونسٹ کانفرنسوں کی رُوداویں۔

اسلام میں عدلِ اجتماعی

از ـــــــ استاذ سید قطب (مصر)

ترجمہ ـــــــ محمد نجات اللہ صدیقی
ایم۔ اے

ایک ایسی کتاب جس نے عرب، یورپ اور امریکہ میں اپنی دھوم مچادی۔

- جس کو عربی، انگریزی اور فرنچ کے بعد اردو میں پیش کیا جارہا ہے
- اسلام کے معاشی نظام پر ایک معرکتہ الآرا کتاب
- موجودہ سرمایہ داری، اشتراکیت اور اسلام کا موازنہ
- اسلام میں تقسیم دولت کا نظام
- اسلام میں عدلِ اجتماعی (SOCIAL JUSTICE) کا انتظام
- مسلمانوں کے لئے نئے نظامِ تعلیم کا خاکہ اور تجاویز
- اسلامی نظام کے داعیوں کے لئے دعوتِ غور و فکر

معاشیات کے طالب علموں کے لئے خصوصی اہمیت کی حامل کتاب۔

ضخامت
۲۲ × ۱۸ / ۸
صفحات ـــــ ۵۷۶
معیاری کتابت و طباعت

قیمت
اعلیٰ ۱۲،۵۰ روپے
ستا: ۸،۵۰ روپے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ ۱۳-ای شاہ عالم مارکیٹ لاہور۔